نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (بعہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ۔ یونس در دہان ماہی ۔ حسن یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعاء توبہ ۔ لقمان ۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت ماروت ۔ حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط ۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید دبیز ۔

قیمت علاوہ محصول پانچر روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات اسپے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے ۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے ۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے ۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے ۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

تحفظ اُردو کا مسئلہ

(ایک اپیل)

دُنیا میں ہر چیز تقسیم ہو سکتی ہے، ہر ملکیت کے حصّے کئے جا سکتے ہیں، ہر ترکہ کو بانٹا جا سکتا ہے، لیکن زبان اور کلچر کے ٹکڑے آپ نہیں کر سکتے

ہماری سرزمین ہند کے دو ٹکڑے ہو گئے، دو حکومتیں علٰحدہ علٰحدہ بن گئیں، لیکن "اُردو" جو کروروں ہندو مسلمانوں کی زبان اور دونوں کے مشترکہ کلچر کی نشانی ہے ہمیشہ ایک ہی رہے گی، اور دونوں کی مشترکہ ملکیت ہی کی حیثیت سے رہے گی

اس لئے اگر آج کوئی حکومت اُردو کی حمایت کرنے پر طیار نہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم بھی اس سے بیزار ہو جائیں کیونکہ یہ چیز حکومت کی نہیں ہماری ہے، ہماری قومی و اجتماعی ملکیت ہے اور جس طرح دوسری ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے ہم حکومت کی امداد سے بے نیاز ہوتے ہیں بالکل اسی طرح "اُردو" کی حفاظت بھی ہمارا اپنا فرض ہے اور بغیر اسکے کہ ہم حکومت سے شکایت کریں، خود ہم کو اس کے بقاو تحفظ کا انتظام کرنا ہے۔

ممکن ہے آپ میں سے کسی کو کانگریس کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ "ہندوستان کی قومی زبان ہندی ہو گی اور رسم خط ناگری" ناگوار ہوا ہو۔ لیکن سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا میں کامیابی کا راز صرف خود اعتمادی ہے اور یہ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تمام دوسرے سہارے ختم ہو جائیں۔

پھر اگر اس وقت تک ہم یا آپ اُردو کی ترقی کی طرف سے غافل رہے تو اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بڑی حد تک حکومت نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔ لیکن اب کہ وہ صورت باقی نہیں رہی ہے، خود ہم میں تحفظ اُردو کا احساس پیدا ہو گا اور یہی ہے بنیاد "خود اعتمادی" کی۔

یقیناً اُردو لکھنے پڑھنے والا کوئی فرد (خواہ وہ مُسلم ہو یا غیر مُسلم ہندوستان کا باشندہ ہو یا پاکستان کا) اس کو کبھی گوارا نہ کریگا کہ اُردو زبان اور اُردو رسم خط فنا ہو جائے اور اسی ایک ذریعہ کو ختم کر دیا جائے جو دونوں قوموں کو ذہنی، ثقافتی (کلچرل)، بلکہ میں تو کہوں گا کہ سیاسی حیثیت سے بھی کسی نہ کسی وقت ایک مرکز پر لا سکتا ہے۔

اس کو یوں نہ دیکھئے، فرض کیجئے آج اُردو کی تمام کتابیں دریا برد ہو جائیں، اُردو کی اشاعت بالکل ختم ہو جائے تمام اخبارات و رسایل بند ہو جائیں، تو آپ پر کیا گزر جائے گی، آپ کی حالت اس وقت بالکل اس شخص کی سی ہو گی جس کا گھر رات کو جلکر خاک ہو جائے

اور وہ صبح کو خاکستر کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا دُنیا کو بالکل تاریک اور سنسان دیکھ رہا ہو۔

میرے کہنے سے نہیں بلکہ آپ خود نہایت سنجیدگی سے غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ کیا اُردو کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی حالت ایسی ہو جائے گی؟ پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپنے اس باب میں کیا سوچا ہے؟ — میرے سامنے اس سلسلہ میں ایک بڑی اسکیم ہے، جس کو میں بالتفصیل اس وقت پیش کروں گا، جب عملی حیثیت سے میں اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر لوں گا۔ لیکن فی الحال چند ابتدائی باتیں بتا دینا ضروری ہیں۔

اگر مرکزی حکومت کی تجویز کے مطابق چند ابتدائی درجوں میں اُردو کی تعلیم باقی بھی رہے اور کم از کم ہم اُردو پڑھنے والے طلبہ کے لئے اُردو کا ایک استاد مقرر کر بھی دیا جائے، تو اس سے نہ اُردو زبان آ سکتی ہے اور نہ اُردو کی کوئی ترقی ہو سکتی ہے۔

اس سے قبل بھی اُردو کا صحیح ذوق رکھنے والے طلبہ کالجوں سے بہت کم نکلتے تھے، لیکن چونکہ ابتدائی درجوں سے لیکر کالج کی انتہائی تعلیم تک اُردو کا مطالعہ کسی نہ کسی حیثیت سے جاری رہتا تھا، اس لئے خیر وہ اس قابل ہو جاتے تھے کہ آیندہ اُردو میں ترقی کر سکیں لیکن اب کہ ابتدائی چند درجوں کے بعد اُردو کی تعلیم بالکل ختم ہو جائے گی، اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے — اور مدارس کی یہ اُردو تعلیم کبھی مفید نہیں ہو سکتی، جب تک ہم دوسرے ذرائع اس کی تکمیل کے اختیار نہ کریں۔

۱— میری رائے میں اس کی ایک تدبیر تو ہے کہ:— مکتبوں کی تعلیم کو پھر جاری کیا جائے۔ مکتبوں کی تعلیم کیا؟ یہ بات شاید موجودہ نسل کے نوجوانوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس لئے مجھے مختصراً اس کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے۔

میرے لڑکپن میں ابتدائی تعلیم کا یہ دستور تھا کہ محلہ کے کسی خوشحال گھر کی ڈیوڑھی پر ایک معلّم بیٹھ جاتا تھا اور پڑوس کے مکانوں کے بچے اس کے پاس جا کر پڑھا کرتے تھے، اور جب وہ اونچی تعلیم کے قابل ہو جاتے تھے تو مدرسوں اور اونچے تعلیمی اداروں میں بھیجے جاتے تھے، حرف شناسی کے بعد ان کو پہلے کلام مجید پڑھایا جاتا تھا اور اسی کے ساتھ فارسی بھی شروع کرا دی جاتی تھی، اور عربی بھی۔ اُردو کے لئے علٰحدہ کوئی نصاب نہ تھا۔ اس تعلیم کے دو فایدے تھے ایک یہ کہ ابتدا ہی سے انھیں مذہبی اخلاق کی طرف توجہ ہو جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ عربی و فارسی تعلیم کی وجہ سے اُردو میں مہارت حاصل کرنے کی اہلیت ان میں پیدا ہو جاتی تھی اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُردو میں اس وقت تک جتنے قابلِ ذکر مصنف یا انشا پرداز پیدا ہوئے ہیں وہ سب کے سب مکتبی تعلیم پائے ہوئے تھے۔

اب ہم کو اس مکتبی تعلیم کے نصاب میں بھی کچھ تبدیلی کرنا پڑے گی، یعنی قطع نظر اس سے کہ اس میں زمانۂ حال کے رجحانات کو سامنے رکھ کر کتابوں کا انتخاب کرنا ہو، ہندی کی تعلیم کو بھی اس میں شامل کرنا چاہیئے اس خیال سے بھی کہ وہ ہماری حکومت اور ہمارے غیر مسلم برادرانِ وطن کی زبان ہے، اور اس لئے بھی کہ اس وقت تک اگر ہم صرف عربی، فارسی اور انگریزی سے اپنی زبان کو وسیع بنانے میں کام لیتے تھے تو اب ہندی اور سنسکرت کی مدد سے اُردو لٹریچر کو اور زیادہ ترقی دے سکیں گے۔

اگر ہمارے بچوں کی مکتبی تعلیم اس نہج پر ہوئی تو، آگے چلکر جب وہ سرکاری مدارس میں جائیں گے تو وہ اپنے ہندو ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل تسلیم کئے جائیں گے کیونکہ ہندو طلبہ تو صرف ہندی کے جاننے والے ہوں گے اور یہ عربی، فارسی اور ہندی تینوں کا ذوق لیکر جائیں گے اور ان کے دماغ یقیناً زیادہ روشن، زیادہ وسیع، اور ترقی کرنے کے زیادہ اہل ہوں گے۔

اس جگہ مسلمانوں کی یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ایک زمانہ تھا جب وہ نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرت میں بھی تصنیفیں کرتے تھے اور ہندوستان کے تمام قدیم علوم میں استادانہ مہارت پیدا کرتے تھے۔

اگر ہم اس طرح کے مکتب جاری کرنے میں کامیاب ہوگئے تو بالکل ممکن ہے کہ ہم حکومت کی مدد بھی حاصل کرسکیں۔ گو میں خود اس کے خلاف ہوں کہ حکومت سے کوئی مدد چاہی جائے، کیونکہ اس طرح پھر ہم کو دوسروں کا سہارا لینے کا خیال پیدا ہوگا اور ہمارے قوا مضمحل ہوجائیں گے۔

۲- دوسری تدبیر یہ ہے کہ ہر جگہ جہاں سرکاری مدارس قایم ہیں، مقامی طور پر انجمنیں قایم کرکے یہ تحقیق کرنا چاہئے کہ ان میں کتنے طلبہ اُردو پڑھنا چاہتے ہیں اور اگر ان کی تعداد ۴۰ تک پہونچتی ہے (اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کم از کم یو۔پی میں کونسا اسکول ایسا ہوسکتا ہے جہاں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد اتنی نہ ہو) تو محکمۂ تعلیم کو متوجہ کرکے وہاں اُردو کا اُستاد مقرر کرانا چاہئے۔

اس تحریک کو "کُل ہند" اصول پر چلانا چاہئے، جس پر میں غور کر رہا ہوں اور اکابر ملک سے استمزاج کرنے کے بعد اس اسکیم کو پیش کروں گا۔

۳- تیسری تدبیر اور بھی ہے، جو مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔ مشکل اس خیال سے کہ اس کا تعلق زیادہ تر ہمارے احساسِ پیش بینی سے ہے اور بدقسمتی سے مسلمانوں کا یہ احساس بہت کمزور ہے اور آسان اس لئے کہ عملی حیثیت سے وہ ہم پر کسی قسم کا بار نہیں ڈالتی۔ آپ یہ غور کیجئے کہ باوجود تمام اقتصادی دشواریوں کے بھی آپ کتنی رقم ایسے مشاغل میں صرف کرتے ہیں جن کا تعلق صرف وقتی تفریح سے ہے اور جن سے آپ کو کوئی مادی یا ذہنی فایدہ نہیں پہونچتا۔ مثلاً آپ سنیما جاتے ہوں گے، ریس میں شرکت کرتے ہونگے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں جاتے ہوں گے، اور اسی طرح کے دوسرے غیر ضروری مشاغل میں آپ کچھ نہ کچھ ضرور صرف کرتے ہوں گے۔

پھر اگر آپ زبان کے مسئلہ کو ضروریات زندگی میں شامل نہ کریں (حالانکہ میرے نزدیک وہ اتنی ہی ضروری ہے جتنے معیشت و معاشرت کے دوسرے مسایل) اور اسے صرف تفریحی چیز ہی قرار دیں تو کیا آپ اپنے سات دن کے مصارف تفریح میں سے صرف ایک دن کے مصارف زبان کی خدمت کے لئے وقف نہیں کرسکتے۔ یقیناً آپ کرسکتے ہیں اور آپ کو کرنا چاہئے۔

۴- چوتھی صورت یہ ہے کہ اس طرح جو رقم آپ خدمت زبان کے لئے علٰحدہ کریں، وہ اس کام میں صرف فرمائیں۔ یعنی اس سے اُردو کی کتابیں، اُردو کے رسایل و اخبارات خود خریدئے اور دوسروں کو آمادہ کیجئے۔

میں دیکھتا ہوں کہ بعض حضرات اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ اگر انھوں نے اُردو کی خدمت کا لفظ زبان سے نکالا تو حکومت ان کی دشمن ہوجائے گی۔

یہ خیال بالکل غلط ہے، حکومت کے کسی بیان یا طرزِ عمل سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ ہندی کو قومی زبان تسلیم کرنے

کے بعد دوسری تمام زبانوں کی دشمن ہوگئی ہے۔ ایسا خیال کرنا در اصل خود ہمارے ذہن کی شکست خوردگی ہے، ورنہ حکومت کو کیا غرض ہے کہ وہ اس مسئلہ میں تعرض کرے، یا اُردو کی خدمت کرنے والوں کو اپنا دشمن قرار دے۔

مجھے یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوتا ہے کہ بعض حضرات اس مسئلہ کو بھی سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنا پسند کرتے ہیں اور وہ تحفظ اُردو کی تحریک کو پاکستانی قسم کی چیز سمجھتے ہیں۔

بڑی غلطی ہوگی اگر اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا ذکر کیا جائے، کیونکہ مسلم لیگ یہاں ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے اور اگر اب اس کا کوئی فرد زبان کے مسئلہ میں دلچسپی لینا چاہتا ہے تو ہم اس کو صرف اس لئے مردود قرار نہیں دے سکتے کہ وہ کسی وقت مسلم لیگ کا ممبر رہ چکا تھا۔

اس سلسلہ میں "انجمن ترقی اُردو" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جب دہلی میں فساد ہوا تو مولوی عبدالحق صاحب پاکستان چلے گئے، حالانکہ ان کو نہ جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ ان کی خدمات کی ضرورت در اصل ہندوستان ہی کو تھی نہ کہ پاکستان کو، لیکن شکر ہے کہ ان کے جانے کے بعد بھی "انجمن ترقی اُردو" فنا نہیں ہوئی اور مرکزی حکومت نے معقول حد تک اس کا دفتر علی گڈھ میں قایم کر دیا ہے۔

ابھی تک انجمن کی طرف سے کوئی پروگرام شایع نہیں ہوا، اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ "ترقی اُردو" کے لئے وہ کیا کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہمیں پوری توقع ہے کہ وہ اس نام کی حرمت کا ضرور خیال رکھے گی جس نام سے وہ قایم کی گئی ہے اور کوئی ایسی اسکیم نہ بنائے گی جس میں مسلم پبلک کو شک و شبہ پیدا ہونے کی گنجایش ہو۔

ہندوستانی بالکل دوسری چیز ہے اور اُردو بالکل دوسری۔

نیاز فتحپوری

مذہب کے متعلق آپ کے دل میں بہت شکوک ہوں گے

آپ سوچتے ہوں گے کہ خدا کیا ہے، رسول کون ہو سکتا ہے، الہامی کتابوں کی کیا حقیقت ہے، دوزخ و جنت سے کیا مراد ہے، حشر و نشر کی کیا اصلیت ہے، عذاب و ثواب کا کیا مفہوم ہے، روح کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح تمام عقاید مذہبی کے متعلق آپ کبھی نہ کبھی ضرور سوچتے ہوں گے اور جب آپ کسی نتیجہ تک نہ پہونچتے ہوں گے تو بڑی اُلجھن میں پڑ جاتے ہوں گے۔ پھر اگر آپ کو یہ اُلجھن دور کرنا ہے اور تعلیمات اسلام کی اصلی روح جاننا ہے تو "من و یزداں" کے دونوں حصے ملاحظہ فرمایئے۔ جو مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سال کی کاوش و تحقیق اور ۵۰ سال کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مذہب و متعلقات مذہب سے واسطہ رکھنے والا کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آپ کو ان کتابوں میں نہ ملے۔ اس کے علاوہ زورِ تحریر اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے بھی یہ اتنا بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ اس کی مثال آپ کو کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

"من و یزداں" حصۂ اول - ۶۷۲ صفحات مجلد معہ رنگین گرد پوش، کاغذ سفید ۲۸ پونڈ

سات روپیہ آٹھ آنے

"من و یزداں" حصۂ دوم - ۴۲۴ صفحات - مجلد - کاغذ سفید - ۲۴ پونڈ

پانچ روپیہ آٹھ آنے

دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول بارہ روپیہ

منیجر نگار

جوش۔ جگر۔ سیماب۔ ماہر وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں

لیکن خود انھیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ کبھی کبھی وہ کیسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ زبان کی غلطی، بیان کی غلطی، فارسی تراکیب کی غلطی عروض و قوافی کی غلطی، لغت کی غلطی۔ حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر بھی اپنی رو میں بعض ایسی غلطیاں کر جاتا ہے، جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ ہر چند ان غلطیوں سے شاعر کی شاعرانہ اہمیت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن پاکیزہ ذوق جو صرف "مئے بے دُرد" کا عادی ہے، ضرور ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اسی "چینِ جبین" کا نام ہے:-

"مالہ و ماعلیہ" ——— گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ

دُنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے

اس کی دردناک داستان اگر آپ کو سننا ہے تو وصی احمد بلگرامی فانی بی۔ اے کی زبان سے سنئے، جو اپنی مخصوص طرزِ تحریر اور زورِ بیان کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو شروع کر کے ختم نہ کرنا، انسانی اختیار سے باہر ہے۔ یہ ہے:-

"ملک خطا کے شہزادے"

قیمت بارہ آنے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی مشہور نظم حرف آخر

ابھی تک مکمل شایع نہیں ہوئی، لیکن اس کے مختلف اجزاء، رسایل و جرایدمیں آچکے ہیں اور اُن کے مطالعہ کے بعد ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ واقعی وہ جوشؔ کے طنزیات کی آخری حد ہے، جس میں خدا سے خطاب کرکے انسان وہ سب کچھ کہہ گیا ہے، جو عالم سرمستی میں کہہ سکتا ہے اس میں شک نہیں یہ نظم واقعی جوشؔ کا حرف آخر ہے، لیکن اس کے جواب میں ایک دوسرے شاعر کا حرف آخر بھی سُن لیجئے:-

"قولِ فیصل"

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر، علی اخترؔ اختر حیدرآبادی نے جوشؔ کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے، کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے، جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، اس نظم میں جو ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے شیطان و شاعر کا مکالمہ کے ذریعہ سے رموزِ کائنات اور اصرارِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، رہی اسکی فنی حیثیت سو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اخترؔ کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ فنِ شعر میں اس سے زیادہ ترقی کی تمنا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔

معہ مقدمہ از نیاز فتحپوری - کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز - گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ

شادی کے باب میں عمر کا تفاوت کتنا بڑا ظلم ہے

یہ ہے اصل مسئلہ جس پر جناب نظیر جمیلی ام-اے نے اس کتاب میں قلم اُٹھایا ہے - پھر یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ کہ کوئی اسے فراموش کر ہی نہیں سکتا - یہ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اس کے سوتیلے جوان لڑکے کی داستان معاشقہ ہے اور اس درجہ دلچسپ اندازِ بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے - اس ناول کی جان وہ خط ہے جو بیوی نے اعترافِ قصور میں اپنے شوہر کو لکھا ہے اور جس کو پڑھنے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

گوہر گوہر گوہر

قیمت ایک روپیہ

تین مقدس ہستیاں بے نقاب

ایک جید مولوی، ایک صاحبِ دل درویش، ایک مشہور ناظم یتیم خانہ - یہ ہیں تین مقدس ہستیاں جن کے چہرہ سے نقاب اُلٹ کر حضرت نیازؔ نے ان کے صحیح خدوخال آپکے سامنے پیش کئے ہیں - آپ پڑھکر حیران رہجائیں گے کہ کیا مذہب، تصوف و اخلاق کے پردے میں انسان اسقدر درندہ ہو جاتا ہے - یہ تینوں افسانے حضرت نیازؔ نے اپنی دورِ انشاپردازی کے اس دور میں لکھے تھے جب انکا طنز اور مزاج اپنی پوری جوانی پر تھا! اگر آپنے ابھی تک اس کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اب ملاحظہ فرمایئے! - "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" - قیمت آٹھ آنے

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پُرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی)

بحرِ احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے۔

ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ بمبئی

سالنامہ "نگار" سنہ ۵۰ء

اتنی عظیم الشان ادبی خدمت ہے، کہ اس کی اہمیت سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ذیل کی فہرست سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سالنامہ قدیم و جدید تنقید کا کتنا زبردست سنگم ہے اور ادبی معلومات میں جو اضافے آپ کو اس کے مطالبہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ کسی دوسری طرح میسر آ ہی نہیں سکتے۔

ذیل کی فہرست سے آپ کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

فنِ تنقید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نیاز فتحپوری
کلام آتشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عارف ہسوی
کلام آزاد انصاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکبر حیدری
میر اور خارجی حالات کی ترجمانی ۔ ۔ محی الدین قادری زور
اثر دہلوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالمنعم سعیدی
میر شیر علی افسوس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید محمد قادری
میر ممنون دہلوی کی شاعری ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالباری آسی
انعام اللہ خاں یقین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عرش فاروقی
صفیر بلگرامی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبدالمالک آروی
لکھنؤ کی داستاں گوئی ۔ ۔ ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی
مرثیہ یا ہجو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عندلیب شادانی
اردو غزل میں تصوف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فراق گورکھپوری
عزیز لکھنوی کی شاعری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فضل الدین اثر

مکاتیب رجب علی بیگ سرور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواجہ احمد فاروقی
غزل کی اہمیت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عبادت بریلوی
ہماری شاعری کا ایک نیا میلان ۔ ۔ ۔ ۔ ایم، عبدالقادر
تنقید کے ایک نئے نقطۂ نظر کی ضرورت ۔ ۔ ۔ سید احتشام حسین
اسلوب بیان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شوکت سبزواری
نئے شاعر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجتبیٰ حسین
اردو میں قصیدہ و مثنوی ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
غزل میں انشا کا اجتہاد ۔ ۔ ۔ رحمت نبی خاں ایم، اے
فانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجنوں گورکھپوری
ترقی پسند ادب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمد مثنیٰ رضوی
لکھنؤ اور اردو ادب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آل احمد سرور
آتش کی عشقیہ شاعری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خلیل الرحمن اعظمی

یہ سالنامہ نگار کے سالانہ چندہ (چھ روپیہ پانچ آنے) میں شامل ہے۔ اس کی قیمت زاید نہیں لی جائے گی
غیر خریداران نگار سے سالنامہ سنہ ۵۰ء کی قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار۔ لکھنؤ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۶ | فہرست مضامین ستمبر ۴۹ء | شمارہ ۳

ملاحظات ---------- ۵

آتش کا تصوف ------ خلیل الرحمٰن اعظمی --- ۹

ام-ان رائے کی مشہور کتاب -- عبدالمالک آروی --- ۲۴

غالب کی شخصیت ------ شوکت سبزواری -- ۳۰

امریکہ کا سبز باغ ---------- ۳۶

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی --- رشید حسن خاں -- ۳۸

ہمارے دیہاتی گیت ---- بسم اللہ بیگم --- ۴۶

یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے --- ایک پروفیسر ---- ۵۰

آثارِ سحر (نظم) ------ افسر سیمائی --- ۵۲

کلام عرشی بھوپالی ---------- ۵۳

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۴

مرثیہ نگاری اور میر انیس --- ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۵۷-۶۴ / ۷۳-۸۰

ملاحظات

فیصلہ کا وقت

انسان کی زندگی کی طرح قوموں کی زندگی بھی یکساں نہیں گزرتی۔ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، کشاکش حیات میں مبتلا ہوتا ہے، اور پھر بیمار یا ضعیف ہو کر مر جاتا ہے، اسی طرح قومیں بھی اُبھرتی اور فنا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، قدرت کا قانون ہے، وقت کا فیصلہ ہے اور تاریخ نام ہے اسی داستان مد و جزر کا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت جس دور سے گزر رہے ہیں، وہ بڑی بے اطمینانی کا دور ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کی موجودہ بے اطمینانی از خود پیدا ہو گئی ہے یا اس کے کچھ اسباب بھی ہیں۔

پاکستان کا قیام کانگرس کی غلطی کا نتیجہ ہو، یا مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیشی کا، اب اس پر بحث فضول ہے، جو ہونا تھا ہو چکا، اسلئے اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ تین چار کروڑ مسلم آبادی جو ہندوستان میں رہ گئی ہے اسے اپنے مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کرنا ہے۔

قدرتاً اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہاں کیا تکلیف ہے اور وہ کیوں اپنے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہیں۔ اس کے جواب میں جو باتیں کہی جا سکتی ہیں یہ ہیں:-

۱ - مسلمانوں پر ملازمت کا دروازہ تقریباً بند کر دیا گیا ہے۔
۲ - مسلمانوں کی زبان، اور ان کے کلچر کو مٹایا جا رہا ہے۔
۳ - مسلمانوں کے لئے کاروبار میں دشواریاں پیدا کی جا رہی ہیں۔
۴ - مسلمانوں کو اپنی جان و مال کی حفاظت کا اطمینان نہیں ہے۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کئے لیتے ہیں کہ یہ چاروں باتیں صحیح ہیں اور اسی کو سامنے رکھ کر آیئے غور کریں کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے ان تمام اندیشوں سے بچنے کی ایک کھلی ہوئی صورت تو ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان پاکستان چلے جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے اس لئے لامحالہ یہی سمجھ کر غور کرنا ہوگا کہ ہمیں یہیں رہنا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم کسی حکومت میں چین سے نہیں رہ سکتے اگر حکومت کو ہم پر اعتماد نہ ہو، اور اگر ہندوستان کی حکومت کا یہ اعتماد ہمکو حاصل نہیں ہے تو پھر نہ ہمیں شکایت کا کوئی حق پہونچتا ہے اور نہ حکومت پر کوئی الزام قایم کیا جا سکتا ہے۔

یہاں کے مسلمان اقتصادی و معاشرتی حیثیت سے تین جماعتوں میں منقسم ہیں:- ایک وہ جو یہاں املاک و جایداد رکھتے ہیں یا بڑے پیمانہ پر تجارت کرتے ہیں، اور خوشحال کہلاتے ہیں، ان کے لئے تو کوئی سوال پاکستان جانے کا پیدا نہیں ہوتا، دوسری جماعت اُن عوام کی ہے جو مزدور ہیں یا کاشتکار ہیں یا بہت چھوٹے چھوٹے پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اور تیسرا طبقہ متوسط الحال لوگوں کا ہے، جن کی معاش کا انحصار زیادہ تر نوکریوں یا چھوٹے موٹے کاروبار پر ہے اور انھیں دونوں جماعتوں کو ہندوستان چھوڑنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر چار کروڑ مسلمانوں میں املاک و جائداد رکھنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۵۰ لاکھ قرار دی جائے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) تو بھی سوال کم از کم تین کروڑ مسلمانوں کی ہجرت کا سامنے آتا ہے۔

اس وقت تک جتنے مسلمان پاکستان گئے ہیں۔ ان کی تعداد ۵۰، ۶۰ لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن اتنی ہی تعداد دیکھ کر پاکستان چیخ اُٹھا اور اب اس نے اپنے دروازے یہاں سے جانے والوں پر تقریباً بند کر دئے ہیں اور اسے بند کر دینا چاہئے۔ اس لئے اگر یہاں کے مسلمان اقتصادی مشکلات کی وجہ سے پاکستان جانا چاہتے ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے زیادہ مشکلات کا سامنا ان کو وہاں کرنا پڑے گا اور پاکستانی حکومت کے لئے وہ ناقابل برداشت بوجھ ہو جائیں گے۔ علاوہ اس کے اگر ۵۰، ۶۰ لاکھ کے لئے وہاں جگہ نکل بھی آئے تو باقی تین کروڑ کہاں جائیں گے اور ان کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر کے چند افراد کا یہاں سے چلا جانا نہایت مکروہ قسم کی خود غرضی ہوگی۔

الغرض اس وقت تک جتنے مسلمان، ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان کا پاکستان کے خواب دیکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم ہم میں سے بعض ایسے ہیں جو زبان سے تو کچھ نہیں کہتے، لیکن اپنے دل میں یہی سوچ رہے ہیں کہ جس وقت انھیں موقعہ مل جائے گا، پاکستان چلے جائیں گے، لیکن یہ ذہنیت ٹھیک نہیں ہے۔ اس تذبذب میں وہ یہاں جی لگا کر کوئی کام نہیں کر سکتے، اور اس طرح اپنی اقتصادی دشواریوں میں اور اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے جو حضرات یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انھیں جلد یا بدیر پاکستان جانا ضرور ہے تو انکو

ابھی چلا جانا چاہیئے تاکہ ان کی یہ ذہنیت متعدی ہو کر دوسروں تک نہ پہونچے اور قوم اس شکست خوردگی میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے بعد جو افراد یہاں رہ جائیں گے، وہ خالص ہندوستانی وطنیت کے ہوں گے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ اپنے مستقبل پر غور کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت کی طرف سے اس وقت تک مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوا تو کوئی رواداری بھی ظاہر نہیں ہوئی۔ لیکن یہ صورت غالباً عرصہ تک قایم نہ رہے گی۔ تقسیم ہند کے بعد جو فساد ملک میں رونما ہوا تھا، اس کے اثرات اتنی جلد محو نہیں ہو سکتے اور ہندو مسلمانوں کے درمیان جو خلیج حایل ہو گئی ہے وہ یوں آسانی سے پُر نہیں ہو سکتی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دُنیا کی کوئی حکومت اپنی ۳۔ ۴ کروڑ رعایا کو ناخوش رکھ کر اطمینان سے نہیں رہ سکتی، اور آج نہیں تو کل اسے مسلمانوں کا دل ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ مگر یہ ہماری غلطی ہوگی کہ ہم اُس وقت کا انتظار کریں، ہم کو چاہیئے کہ ہم خود حکومت سے قریب تر ہوتے جائیں، اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر ہر فرد کانگرس میں شامل ہو جائے اور ان کو جو شکایتیں حکومت کی طرف سے پیدا ہوں، انھیں کانگرس ہی کے پلیٹ فارم پر ظاہر کریں۔ مسلمانوں کا یہ خیال غلط ہے کہ کانگرس ہندوؤں کی چیز ہے، وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی ملکیت ہے اور اگر اس ملکیت سے کوئی فایدہ نہ اُٹھائے تو یہ اس کی غلطی ہے۔

ہندوستان کی قومی زبان

آخر کار زبان کا جھگڑا بھی تقریباً طے ہو ہی گیا اور ہندی زبان ناگری رسم خط میں ہندوستان کی قومی زبان قرار دیدی گئی۔ ہندی زبان سے کیا مراد ہے اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اس زبان اور رسم خط کی نوعیت کیا ہو گی، اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن جس حد تک مرکز اور ہمارے صوبہ کا تعلق ہے، یہ بات صاف ہو گئی اور بہت اچھا ہوا کہ اس میں زیادہ دیر نہ کی گئی۔ کیونکہ اس طرح ہندوستانی بولنے والوں اور اُردو رسم خط اختیار کرنے والوں کا تذبذب دور ہو گیا اور اب اگر انھیں اپنی زبان اور رسم خط کے تحفظ کا خیال ہو گا تو وہ اپنے طور پر جو کچھ کرنا ہے کریں گے۔

جس حد تک سرکاری مدارس کا تعلق ہے، اُردو کو ختم ہی سمجھنا چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ زبان یا رسم خط جس کا ۹۔ ۱۰ کروڑ انسانوں سے تعلق ہے، فنا ہو جائے گا اور کیا ہندوستان کی مسلم آبادی اس کو مٹ جانے دے گی۔

اب یہ بحث بیکار ہے کہ اُردو یا ہندوستانی ہندو مسلم کلچر کے امتزاج کا نتیجہ ہے اور اس کا ادبی و علمی ذخیرہ ہندو مسلمان دونوں کا ملا جلا ترکہ ہے (کیونکہ ہندو اسے تسلیم نہیں کرتے)۔ اب تو مسلمانوں ہی کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اس کے تحفظ کے لئے آمادہ ہیں یا نہیں، اور اگر ہیں تو اس کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں۔

مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ زبان کا مسئلہ ان کی حیات اجتماعی کا مسئلہ ہے اور اگر انھوں نے اپنی زبان کو مٹ جانے دیا تو اسکے معنے یہ ہوں گے کہ انھوں نے اپنے اجتماعی جثہ کی شہ رگ کو کاٹ دیا اور پھر دُنیا کی کوئی قوت ان کو فنا ہونے سے نہیں بچا سکتی۔

انگریزی حکومت کے زمانہ میں اگر مسلمانوں کو اس طرف زیادہ توجہ نہ تھی تو مضایقہ نہ تھا، کیونکہ خود حکومت کی طرف سے کوئی قدم ایسا نہیں اُٹھایا گیا تھا کہ اُردو کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہوتا، لیکن اب صورت بالکل مختلف ہے اور ہم کو متفقہ قوت کے ساتھ

یہ فیصلہ کرلینا ہے کہ ہم اُردو کو فنا ہونے نہ دیں گے اور اس کی ترویج و اشاعت کو اپنا فرض اولین قرار دیں گے۔

اب وہ وقت نہیں کہ آپ اُردو کی کتابوں اور اُردو کے اخبارات و رسایل کی طرف سے غفلت برتیں، اب تو ان کی زندگی کی ذمہ داری تنہا آپ ہی پر عاید ہوتی ہے اور آپ کو اپنی ضروریات حیات میں اس کو بھی جگہ دینا ہے۔

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اس کے لئے کوئی بڑی قربانی کریں۔ اگر آپ اپنے غیر ضروری مصارف تفریح کا صرف دسواں حصہ کتابوں اور اخبارات و رسایل کے لئے وقف کردیں تو بھی زبان کے لئے یہ عظیم خدمت ثابت ہوگی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ہندی نہ سیکھئے، ضرور سیکھئے اور یہ بات میں آج نہیں کہتا بلکہ اب سے دس سال قبل بھی میں نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندی ضرور سیکھیں کیونکہ وہ اس طرح اپنی زبان کو اور ترقی دے سکیں گے اور ہندوؤں کی روایات سے واقف ہوکر ان سے قریب تر ہو جائیں گے۔

اس سلسلہ میں ہندوستانی کا سوال بھی سامنے آتا ہے اور گو مہاتما گاندھی کے فیصلہ کے خلاف اس کو قومی زبان بنانے کے مسئلہ پر اس وقت کوئی غور نہیں کر رہا، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ عوام کی زبان ہندوستانی ہی رہے گی اور سنسکرت آمیز ہندی کبھی عوام میں مقبول نہ ہوگی۔ اس لئے اُردو کی حفاظت و حمایت کے وقت اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ ہماری تصانیف کی زبان وہی ہونا چاہئے جو عوام کے ذہن سے دور نہ ہو۔ اس طرح ہم نہ صرف یہ کہ اُردو کو زیادہ آسانی کے ساتھ پھیلا سکیں گے بلکہ ہندی کے ثقیل لٹریچر کے مقابلہ میں جس وقت اپنی تصانیف کو ناگری رسم خط میں پیش کریں گے تو عوام انھیں کی طرف زیادہ مایل ہوں گے اور رفتہ رفتہ ہندوستانی کے مقابلہ میں سنسکرت آمیز ہندی از خود پیچھے ہٹ جائے گی۔

اگر ہمارے ادارے جو اس وقت اُردو کی اشاعت کر رہے ہیں، اُن کتابوں کو جو ہندوستانی زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں، ناگری رسم خط میں بھی چھاپنا شروع کردیں اور ہندوؤں کی سنسکرت آمیز کتابوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی بازار میں لے آئیں تو اس سے دو نتیجے مترتب ہوں گے ایک وہ جس کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں یعنی یہ کہ اس طرح ثقیل ہندی کی جگہ ہندوستانی لے لیگی اور دوسرے یہ کہ مسلمان ناگری رسم خط سے واقف ہونے کے بعد ہندوؤں کے اس لٹریچر سے واقف ہو جائیں گے جس کا مطالعہ نہ صرف ہندوستانی اور اُردو کی ترقی بلکہ ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے بھی ازبس ضروری ہے۔

یہاں تک تو ہوئی اُصولی گفتگو، اب آیئے غور کریں کہ عملاً اسکی کامیابی کی صورت کیا ہے۔ اسکی سب سے زیادہ موثر تدبیر یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے لئے جو رقم ۴۵ ہزار سالانہ کی مرکزی حکومت کی طرف سے منظور ہوئی ہے، اسے اُردو کے تحفظ و ترقی پر صرف کیا جائے، اور اسکے علاوہ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب انجمن کے صدر اور قاضی عبدالغفار صاحب انجمن کے سکریٹری ضرور کوئی ایسا پروگرام طیار کریں گے جو انجمن کے نام کے لحاظ سے موزوں و مناسب ہو۔ دوسری تدبیر (جس پر انجمن ترقی اُردو ہی کو عمل کرنا چاہئے) یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام شہروں اور قصبوں میں مسلم پبلک سے بھی امداد کی اپیل کیجائے۔ انجمن کی شاخیں قایم کرکے انجمن کے سرمایہ کو بڑھایا جائے اور اس سے اداروں کی مدد کی جائے، جو انجمن کے مقرر کردہ اصول پر کام کرنے کے لئے طیار ہیں۔ لیکن قبل اس کے اس پر عمل کیا جائے، یہ ضروری ہے کہ پہلے انجمن اپنا لایحۂ عمل واضح طور پر متعین کردے، تاکہ آیندہ کسی شک و شبہ کی گنجایش باقی نہ رہے اور پبلک کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ وہ انجمن کے صحیح ارادوں سے واقف نہ تھی۔

آتش کا تصوّف

شاعری میں تصوف کی دو صورتیں ملتی ہیں - ایک تو ان شعراء کا کلام جو نہ صرف صوفیانہ عقاید پر مکمل طور پر ایمان رکھتے تھے بلکہ ان کی زندگی عبارت تھی ان عقاید کو عملی جامہ پہنانے اور ان عبادات کے ذریعہ ان روحانی مدارج سے گزرنے کی جن کے اصول و ضوابط قدماء نے مدون کئے تھے، دوسری صورت وہ ہے جو "برائے شعر گفتن خوب است" کی حیثیت سے آتی ہے یعنی ان شعراء کے یہاں مضامین تصوف تو ملتے ہیں لیکن ان کا تعلق ان کی زندگی سے بالکل نہیں، اول الذکر شعراء کے یہاں ہمیں زندگی کا ایک ہی رخ ملتا ہے اور موضوع کے لحاظ سے نہ صرف ان کی شاعری محدود ہے بلکہ حیات و کائنات کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ بہت تنگ اور محصور ہے، لیکن ان کی شاعری بلند پایہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر بہت کیف اور بھرپور شاعرانہ احساس رکھتی ہے - اس میں شاعر کی شخصیت اور اس کی شاعری کا رشتہ کہیں الگ نہیں ہونے پاتا اور انداز بیان اور فن کے اعتبار سے بھی اسکے بعض حصے اعلیٰ شاعری سے مماثل ہو جاتے ہیں - لیکن تصوف کی دوسری صورت جن شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے ان کے یہاں شاعری کا یہ حصہ اکثر بے جان اور رسمی ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ انھوں نے یہاں ان کیفیتوں اور ان مدارج سے گزرے بغیر صرف خیالات کو نظم کر دیا ہے جس میں جذبے کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر کہیں کہیں خیال نے جذبے کی حدود کو چھو بھی لیا ہے تو وہ جذبہ مستعار ہے، اس میں ایک ہلکی سی نشہ آگیں کیفیت تو آسکتی ہے لیکن وہ جذب و سرور نہیں جو ایک صوفی شاعر کے یہاں ہوتا ہے - فارسی میں رومی کی شاعری صوفیانہ شاعری کا سب سے بڑا اکتساب ہے، اردو میں کوئی بہت بڑا صوفی شاعر تو نہیں پیدا ہو سکا جس کے یہاں وہ عظمت اور وہ فلسفیانہ گہرائی ہو جو مولانا روم کے یہاں ہے لیکن خواجہ میر درد کی شاعری اثر اور کیفیت کے اعتبار سے نہ صرف صوفیانہ شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے بلکہ ان کی شاعری میں شاعر کی شخصیت اور اس کے محسوسات میں کہیں تضاد نہیں پایا جاتا - تصوف کی دوسری قسم اردو کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں پائی جاتی ہے لیکن بڑے بڑے شعراء کے کلام کا یہ حصہ بھی بے جان اور رسمی ہو کر رہ گیا ہے - میر ہوں یا مصحفی، ناسخ ہوں یا ذوق، یہ سب شعراء منہ کا مزہ بدلنے اور شاعری میں تنوع پیدا کرنے کی خاطر کبھی کبھی غزلوں میں دو ایک شعر ایسے بھی رکھ دیتے تھے جن میں عشق حقیقی، ترک، فنا، معرفت، توحید، توکل، رضا اور فقر کے وہ مسایل آجاتے تھے جن کا علم ان شعراء کو کتابوں کی مدد سے یا قدیم شعراء کے کلام کے مطالعے کے بعد ہوا تھا - یہی وجہ ہے کہ ان شعراء کے کلام میں جہاں ان کی اصل شخصیت ظاہر ہوئی ہے وہ انداز بیان، زور اور اثر ہر اعتبار سے اس رسمی حصے سے مختلف ہے - البتہ غالب اپنی بھاری بھرکم آواز کی وجہ

سے کبھی کبھی اپنے ان اشعار میں بھی وہی انداز پیدا کر لیتے ہیں جو ان کی شاعری کے اصل حصے میں ہے لیکن اول تو غالب کے یہاں اس کی حیثیت جذباتی کم اور فلسفیانہ و مفکرانہ زیادہ ہو جاتی ہے، دوسرے غالب ایسا شاعر ہے جو ذرا ہمارے سامنے بالکل عریاں ہو کر کم آتا ہے، وہ اکثر خود کو بہت لئے دئے رہتا ہے، اس کے اندر وہ خلوص اور وہ سچ بولنے کا انداز نہیں ہے جو میر کے یہاں ہے اسی لئے وہ تو یوں بھی بقول فراق ایک "چور" شاعر ہے جو اس طرح چھپ کر آتا ہے کہ اسے مکمل طور پر دیکھ لینا مشکل ہے۔

لیکن تصوف کی ان دو قسموں کے علاوہ بھی ایک قسم کی شاعری ملتی ہے جس میں تصوف کے عقاید اور صوفیانہ اعمال کی پابندی نہیں کی جاتی، کہیں کہیں اس سے انحاد بھی ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں انحراف بھی اور یہ شاعری اس کے باوجود رسمی اور روایتی نہیں ہوتی اور نہ شاعر کا انداز بیان اس کی شاعری کے بقیہ حصہ سے یہاں مختلف ہوتا ہے۔ اس شاعری میں شاعر کی شخصیت مکمل طور پر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس شاعری میں جذبہ و اثر تو ہوتا ہی ہے وسعت کے اعتبار سے بھی یہ صوفیانہ شاعری کی حدود سے نکل کر پوری زندگی کی شاعری بن جاتی ہے۔ یہ شاعری شاعر کے یہاں کن اسباب کی بنا پر آتی ہے یہ میں ابھی بتاؤں گا لیکن اس کی مثال کیلئے فارسی میں حافظ اور اردو میں آتش کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے متعلق میں نے ایک بار پہلے بھی کہا ہے کہ ان کے یہاں خالص تصوف نہیں بلکہ عارفانہ سرمستی ہے اور یہ عارفانہ سرمستی اس حصہ کے علاوہ جس میں موضوع کے لحاظ سے متصوفانہ عقاید کا پرتو ہے، ان کی شاعری کے دوسرے موضوعات پر بھی حاوی ہے اور اسی نے ان کو لب و لہجہ اور اپنی آواز دی ہے۔

آتش پر لکھتے وقت بڑے بڑے نقادوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ وہ صوفی شاعر تھا، انھوں نے آتش کی شاعری کی دوسری خصوصیات بیان کرنے کے بعد ایک حصے میں تصوف سے بحث کی ہے۔ اس "تصوف" کے لئے انھوں نے آتش کے دیوان سے وہ اشعار تلاش کئے جو تصوف کے عقاید پر پورے اترتے ہیں مثلاً معرفت، توحید، ترک، فنا، رضا، توکل وغیرہ اور اس طرح یہ دکھائے بغیر کہ اس شاعری کا اس کی شاعری کے بقیہ حصے سے کوئی تعلق ہے یا نہیں، لب و لہجہ، انداز بیان اور زندگی کے متعلق زاویۂ نظر میں کوئی مناسبت ہے یا نہیں یا ایک حصے نے دوسرے حصے کو کہاں تک متاثر کیا ہے۔ انھوں نے اسے تصوف کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کے اس بیان کو پڑھے کہ آتش تصوف کے شاعر تھے اور پورا دیوان پڑھے اور اس میں ان اشعار سے گزرے جہاں تصوف سے اختلاف ملتا ہے اور صوفیانہ اعمال و عقاید سے انحراف کیا گیا ہے تو عام قاری یہی سوچے گا کہ یا تو شاعر کے یہاں تضاد پایا جاتا ہے یا پھر اس کی زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور ایک خانے کا دوسرے خانے سے کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب "آئینۂ معرفت" میں بھی یہی غلطی کی ہے اور بجائے آتش کی شاعری کے اس تمام حصے پر تنقید کرنے کے جہاں عارفانہ سرمستی ملتی ہے صرف اسی حصے کو دکھایا ہے جہاں تصوف سے اصولی مطابقت ملتی ہے اسی طرح انھوں نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ آتش کے یہاں

بھی تصوف ملتا ہے اور وہ ایک صوفی شاعر تھا، اس کے ثبوت کے لئے انھوں نے ابتدا ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ چونکہ انکے آبا و اجداد صوفی تھے اس لئے تصوف انھیں ترکے میں ملا۔ اولاً تو فاضل نقاد کو یہ خود معلوم ہے کہ آتش کی زندگی آزاد اور قلندرانہ تو ضرور تھی لیکن صوفیانہ ریاضت و عبادت اور خانقاہ والے تصوف سے بہت دور تھی جو ان کے آبا و اجداد کی تھی دوسرے یہ کہ ان کی شاعری میں ان چند اشعار کے علاوہ جن میں اصولی تصوف پایا جاتا ہے ایسے اشعار بھی ہیں جن میں "تحریف شدہ" تصوف پایا جاتا ہے۔ وہ جہاں تک حقایق و معارف کا تعلق ہے تصوف کا ساتھ دیتے ہیں لیکن صوفیوں کی طرح انکے دماغ پر موت کا تصور طاری نہیں ہے بلکہ ان کی پوری شاعری میں رجائیت اور زندہ رہنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے، اس لئے وہ تھوڑی دیر کے بعد ہی تصوف سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں اس صورت میں وہ انھیں تصوف کا شاعر کہیں گے یا اس تبدیلی کے وجوہ تلاش کرنے پڑیں گے۔ دوسرے شعراء کے یہاں تو یہ نبھ سکتی ہے لیکن آتش کی شخصیت اور ان کا اندازِ بیان متصوفانہ اور غیر متصوفانہ دونوں کی شاعری میں یکساں ہے اس لئے خانوں میں تقسیم کر دینے والی رسم ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتی ہے اور تنقید نگار کو خود یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آتش کی شاعری کا مجموعی طور پر کیا اندازِ بیان ہے اور زندگی کے متعلق اسکا رویہ کیا ہے۔ وہ عام شعراء کی طرح اسے بھی اسی لاٹھی سے ہانکتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جس طرح اس نے میر، درد، غالب، آسی غازی پوری، عزیز لکھنوی اور ڈاکٹر محمد اقبال کے کلام سے تصوف کے اجزاء کو الگ کر کے ان کو تصوف کے زمرے میں شامل کیا ہے، آتش کو بھی شامل کرے۔ دراصل نقاد بنیادی غلطی یہ کرتے ہیں کہ ہر اس شعر کو جس میں ردیف و قافیہ ہوتا ہے "شاعری" میں شمار کرتے ہیں اور اس طرح اس حصے کو بھی شاعر کے اصلی خیالات اور اس کی شخصیت کا جزو سمجھتے ہیں جو بے جان اور رسمی ہے حالانکہ شاعر کے اصلی خیالات وہی ہوتے ہیں جہاں اس کا پورا انداز بیان جھلک جائے، وہیں اس کی شخصیت ملے گی اور اسی حصے کو ہم اس کی اصل شاعری سمجھیں گے ورنہ کہنے کو تو میر کے یہاں بیشتر ایسے اشعار ملجائیں گے جن میں مضمون کے اعتبار سے مسرت و انبساط کا پہلو ہے لیکن ان اشعار میں نہ تو میر کا لب و لہجہ ملتا ہے اور نہ ان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ تنقید کے اسی نقطۂ نظر کا سہارا لیکر عندلیب شادانی نے میر کا دیوان لیکر ان تمام اشعار کو ایک جگہ جمع کیا جن میں امرد پرستی کے خیالات ملتے ہیں، اس طرح انھوں نے میر کو ایک امرد پرست شاعر ثابت کر دیا۔ حالانکہ ایک معمولی ذوق کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ان اشعار میں سرے سے میر کا لب و لہجہ نہیں ہے اور نہ وہ آواز ہے جس کی وجہ سے ہم میر کو دور ہی سے پہچان لیتے ہیں۔

آتش پر رائے قایم کرنے کے لئے اور یہ پتہ لگانے کے لئے کہ زندگی کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ کیا ہے اس حصہ کو الگ کر دیجئے جو محض ردیف و قافیے کے لئے کہا گیا ہے۔ اب رہا وہ حصہ جس میں آتش کا لب و لہجہ اور ان کی آواز نمایاں ہے اس میں یہ دیکھئے کہ وہ اشعار جن میں تصوف ہے ان میں کہاں تک ہمواری، یکسانیت اور مطابقت ہے اور اس کا تصوف کے اصلی اور بنیادی عقاید سے کوئی علاقہ ہے یا نہیں۔ آتش کی شاعری کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو بالکل بے جان اور

روایتی ہے اور اس روایتی حصہ میں تصوف کے مضامین بھی مل جائیں گے لیکن ان شعروں میں تصوف دیکھ کر ہم آتش کے تصوف سے نہ کوئی بحث کر سکتے ہیں اور نہ وہ تصوف شاعر کا تصوف کہا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود آتش کی شاعری کے اصل حصے میں بھی ہمیں تصوف ملتا ہے جو میرؔ، غالبؔ وغیرہ دوسرے شعرا کے یہاں نہیں۔ میرؔ اور غالبؔ وغیرہ کی شاعری کے اصل حصہ میں کہیں تصوف کا پتہ بھی نہیں، اور بقیہ حصہ میں جو تصوف ہے اس کے بارے میں، میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ وہ مجرد تصوف ہے اور اس کا شاعر کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔

اب آتش کی شاعری کے اس حصہ کی طرف آیئے جو ان کی اصل شاعری ہے۔ اس میں جو تصوف ہمیں ملتا ہے اسکی حیثیت مذہبی یا تقلیدی نہیں بلکہ تہذیبی (Cultured) ہے۔ یعنی شاعر کی شخصیت کی تعمیر زندگی اور ماحول کی جن قدروں سے ہوئی ہے اس میں جہاں سیاست، معاشی حالت، سوسائٹی، رسم و رواج، خانگی معاملات اور آئے دن کے انقلابات کا اثر ہوگا وہاں اس کے ذہن پر ان تصورات و عقاید کا بھی اثر پڑے گا جو مذہب، معاشرت اور قدیم روایات سے آئے ہیں۔ اگر انسان کی شخصیت انفعالی ہے تو وہ ان تمام تصورات کو قبول کرے گا چاہے اس کی زندگی کے تجربات اس کے سامنے یہ حقیقت پیش کریں کہ یہ تصورات اب زنگ آلود ہو چکے ہیں، انھیں وقت اور ماحول کے مطابق بدلا جا سکتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان کے خلاف کسی قسم کی آواز اٹھائے یا ان سے علٰحدہ ہو کر سوچ سکے۔ اس لئے وہ اپنی زندگی میں تو ان اصولوں کو خیرباد کہہ کر وہی سب کچھ کرے گا جو وقت کے پیش نظر مفید اور مناسب ہوگا لیکن جب ایسا شخص شعر کہے گا تو ان تصورات کو جوں کا توں اسی شکل میں پیش کرے گا۔ مذہبی عقاید میں اور اس کے اشعار میں کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ ایک طرح سے وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی میں چاہے جو کچھ کروں لیکن مذہب کے محتسب میرے خیالات کی بنا پر مجھے برا تو نہیں سمجھیں گے۔ لیکن اس کا یہ فریب اس وقت کھل جاتا ہے جب نقاد اس کی شاعری میں جذبہ اور خلوص کو پرکھتا ہے۔ اس قسم کا تصوف مذہبی تصوف کہا جائے گا لیکن آتش کی شخصیت میں انفعالیت نہیں، اس کے اندر ایک مردانہ عزم اور قدیم سے بغاوت کے عناصر پائے جاتے ہیں اس لئے وہ لوگوں کی پروا کئے بغیر ان اصولوں کے اندر اپنے ماحول، اپنی زندگی اور اپنی طبیعت کے مطابق ردوبدل کر لیتا ہے، انھیں نئی شکلیں اور نئی صورتیں دیتا ہے، ان میں نئے تصورات اور نئے تخیل کی آمیزش کر لیتا ہے اور اس کو اپنے حال سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ اسی لئے اس تصوف کو میں نے تہذیبی تصوف کہا ہے۔

اس کے لئے سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ آیا وہ مذہبی برتری کا قایل ہے یا نہیں، کیا وہ اپنے مذہب کو تمام مذاہب سے بہتر سمجھتا ہے یا وہ عام انسانی قدروں کو مانتا ہے۔ آپ آتش کا دیوان پڑھیں گے تو اس کے خیالات پر یہ چیز چھائی ہوئی دیکھیں گے کہ وہ اس قسم کی حد بندیوں کا قایل نہیں۔ ایک دو جگہ نہیں بار بار وہ اس خیال کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ مذہب کی تفریق نہیں کرتا بلکہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے۔

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش — شیخ ہو یا کہ برہمن ہو پر انساں ہووے

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا — مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

رند مشرب ہوں مجھ کو کیا ہووے — مذہبوں میں جو اختلاف ہوا

قید مذہب کی نہیں حسن پرستوں کے لئے — کافر عشق ہوں میں، کوئی مراکیش نہیں

دل کی کدورتیں اگر انساں سے دور ہوں — سارے نفاق گبر و مسلماں سے دور ہوں

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے — دل سے غبار کافر و دیندار لے چلے

اب یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اس نے تصوف کے اصولوں کو اس لئے نہیں اپنایا کہ وہ خود اس کے مذہب کی چیز تھا اور ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ اسے مذہب کے اُصولوں کی حیثیت سے بھی اس زمانے میں تصوف کو چھوڑ دینا چاہئے تھا کیونکہ آتش کے آباواجداد تو تصوف کے اصولوں پر عمل پیرا تھے اور خود پیری مریدی اور حال و سماع کا سلسلہ ان کے یہاں جاری تھا لیکن آتش کے زمانہ میں تصوف کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہو چکا تھا، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک طرف تو اس کی مخالفت ان علماء کی طرف سے ہوئی جو اسلام میں کسی قسم کی تبدیلی اور ترمیم و تنسیخ کے قایل نہیں تھے۔ صوفیوں نے بعد میں تصوف میں وقت اور ماحول کے پیشِ نظر چند ایسی چیزوں کا اضافہ کر لیا تھا جو زندگی کو ایک ترقی پذیر راستے پر ڈال سکتی تھیں لیکن علمائے اسلام کے نزدیک اس قسم کی "بدعت" داخل کفر تھی۔ دوسری طرف ایران میں صفویوں کے مظالم کی وجہ سے شیعوں میں بھی تصوف کے خلاف ایک تحریک، شروع ہو چکی تھی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ میں شیعیت کا عروج تھا جس کی وجہ سے وہاں کے اکثر شاعروں نے نہ صرف اپنی زندگی سے تصوف کو نکال کر پھینک دیا بلکہ شاعری کو بھی تصوف کے اثرات سے پاک کیا۔ آتش ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور مذہبًا انھیں بھی تصوف سے بدظن ہو جانا چاہئے تھا لیکن انھیں تصوف کے اندر زندگی کی ترقی پسند قدریں نظر آئیں اور اس کے اندر جو کچھ تبدیلیاں ہوئی تھیں وہ ان کے نزدیک مستحسن تھیں اس لئے انھوں نے تصوف کو اپنایا، اس وقت تصوف کو اپنانا، اس کے مطابق زندگی گزارنا یا اپنی شاعری میں ان جذبات و احساسات کا اظہار کرنا جو تصوف کی حدود میں آتے ہیں ایک بہت بڑی بغاوت اور سوسائٹی کے خلاف ایک اقدام تھا جس کا سہرا آتش کے سر ہے۔ اس لئے سب سے پہلی بات یہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ آتش کا تصوف مذہبی ہونے کے بجائے تہذیبی ہے اور یہ اپنے وقت کا بہت بڑا اکتساب ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت بھی ہمیں ملتا ہے جب وہ اپنی زندگی میں مذہب و ملت کی قید سے الگ ہو جاتے ہیں اور عام انسانی اصولوں پر عمل کرنے لگتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ ان تبدیل شدہ اصولوں میں خود بھی اپنی شخصیت اور اپنی زندگی کے مطابق ردوبدل کرتے ہیں اور اسے نئی راہوں سے آشنا کرتے ہیں۔

آتش کے متعلق میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ ان کی شخصیت میں وسعت ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری 'انا' کے

خول سے نکل کر خارجی محرکات و اسباب تک پہونچتی ہے اور ان تمام تجربات سے گزرنے کے بعد زندگی کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ نشاطیہ ہوجاتا ہے۔ اسی نشاطیہ رجحان کا ایک جزو تصوف سے لگاؤ بھی ہے ——— لیکن ان کا لگاؤ عبادت ریاضت اور شب زندہ داری کے بجائے جن کا تعلق خانقاہ کے تصوف سے ہے آزادی، بیباکی، رندی و سرمستی، اکڑ، بانکپن مردانگی وغیرہ سے ہوتا ہے جو تصوف خانقاہ سے تعلق رکھتا ہے اس کا راستہ موت کی طرف جاتا ہے لیکن آتش تصوف کے ذریعہ حرکت و حیات کا پیغام دیتے ہیں اور زندگی کے چھپے ہوئے بھیدوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ انھیں عناصر سے مل کر ان کا مزاج بنا اور نہ صرف اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان کا اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ یہی رویہ رہتا تھا بلکہ پوری کائنات کا مطالعہ کرتے وقت ان کا نقطۂ نظر یہی تھا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی جس طرح گزاری اس سے ہر شخص واقف ہے۔ کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے، کسی کی خوشامد یا تعریف نہیں کی، کسی کی شان میں کبھی قصیدہ نہیں لکھا، فقر و فاقہ کے باوجود کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا بلکہ خودداری اور شان استغنا کی وجہ سے مصیبتیں سہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ ہوتے ہوئے نہ تو کبھی مذہبی تعصب و تنگ نظری میں مبتلا ہوئے، نہ کبھی مذہبی رسوم (محرم، مجلس عزا وغیرہ) کی پابندی کی بلکہ اپنا مسلک انھوں نے الگ ہی بنالیا جو ان کے نزدیک نہ صرف صحیح تھا بلکہ اس کے مطابق زندگی گزارنے سے ان کو ذہنی اطمینان و سکون حاصل تھا آبحیات میں آزاد نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ آتش کبھی نماز نہ پڑھتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے جو سنی المذہب تھے انھیں اپنے مذہب کے مطابق نماز کا طریقہ بتادیا۔ وہ جب کبھی نماز پڑھتے اسی طریقے کے مطابق پڑھتے۔ ایک بار انھیں ایسی جگہ جانا ہوا جہاں شیعہ مذہب سے تعلق رکھنے والے حضرات جمع تھے۔ انھیں آتش کے بارے میں یہ یقین تھا کہ وہ مذہباً شیعہ ہیں لیکن آتش جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو انھوں نے سنیوں کے مذہب کے مطابق نماز ادا کی۔ اس پر لوگوں نے جب انھیں بتایا کہ یہ نماز تو شیعوں کی نہیں ہے، تو انھوں نے حیرت سے کہا "مجھے تو یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک ہی خدا کی دو نمازیں ہوتی ہیں"۔ یہ واقعہ ہے تو معمولی لیکن اس سے ان کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ مزاج کے انھیں عناصر کی وجہ سے تصوف بھی ان کی شخصیت کا ایک جزو بن گیا اور اس تصوف کی وجہ سے ان کی شاعری میں مجموعی طور پر ایک لب و لہجہ کا آغاز ہوا جس میں رندی و سرمستی اور مردانہ بانکپن ہے۔

آتش کی صوفیانہ شاعری کے دو حصے کئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو وہ شاعری جب ان کے ذہن پر عرفان و آگہی کے تصورات وجدانی طور پر آتے ہیں اور وہ اپنے دل میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں، اس کیفیت کا اثر وقتی نہیں ہوتا بلکہ ان کے دل و دماغ پر ایک مدت تک روحانی اور مابعد الطبیعیاتی تخیل، جذب و سرور اور ماورائی کیف و کم چھایا رہتا ہے۔ اس دور میں ان کی پوری غزلیں اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک ہی فضا اور ایک ہی موڈ ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جب ان کی زندگی میں کوئی ایسا تجربہ آتا ہے جس کے سہارے وہ ایک حقیقت تک پہونچتے ہیں تو اس حقیقت کا اظہار شاعرانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن اس میں جذباتی پہلو کم اور اخلاقی پہلو زیادہ ہوتا ہے۔

وجدانیات اور عرفان و آگہی کے سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس میں سرور و مستی اور جوش و خروش کے باوجود گہرائی اور مفکرانہ انداز بیان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حقایق و معارف خارجی دنیا سے آئی ہوئی کوئی شے نہیں معلوم ہوتے بلکہ شاعر کے دل کی اندرونی لگن اور خود اس کے ذاتی تجربات اور احساسات معلوم ہوتے ہیں، مثلاً آتش کے دیوان کے شروع ہی میں آپ کو دو غزلیں ایسی ملیں گی جو پوری کی پوری اسی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہیں:-

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

اسیر اے دوست تیرے عاشق و معشوق دونوں ہیں
گرفتار آہنی زنجیر کا یہ وہ طلائی کا

تعلق روح سے مجھ کو جسد کا ناگوار اہے
زمانے میں چلن ہے چار دن کی آشنائی کا

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا

نکل اے جان تن سے تا وصالِ یار حاصل ہو
چمن کی سیر ہے انجام بلبل کی رہائی کا

وصال یار کا وعدہ ہے فردائے قیامت پر
یقیں مجھ کو نہیں ہے گور تک اپنی رسائی کا

دل اپنا آئینہ سے صاف عشق پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا

کفِ افسوس ملواتی ہے تیری پاک دامانی
بنھا کر شاہدِ عصمت کو جامہ پارسائی کا

نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو دعویٰ ہے خدائی کا

حُسن پر ہی اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش
بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اس کا

گریاں ہے اگر شمع تو سر دھنتا ہے شعلہ
معلوم ہوا سوختہ پروانہ ہے اس کا

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اس میں
معمورۂ عالم جو ہے ویرانہ ہے اس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اس کا

دل قصر شہنشہ ہے وہ شوخ اس میں شہنشہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلوخانہ ہے اس کا

وہ یاد ہے اس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اس کا

اللہ رے صفائے دو نیا گوش کا عالم
مشتاق ہر اک گوہر یکدانہ ہے اس کا

آوارگیِ نکہتِ گل ہے یہ اشارہ
جامہ سے جو باہر ہے وہ دیوانہ ہے اس کا

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش لبریزِ مئے شوق سے پیمانہ ہے اس کا

ان دو غزلوں کو ان کی عشقیہ غزلوں سے ملا کر دیکھئے تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ شاعر کی شخصیت وہی ہے، وہی آواز، وہی لب و لہجہ اور سوچنے کا وہی انداز ہے۔ البتہ ان تجربات و محسوسات کی نوعیت ان سے مختلف ہے۔ وہاں مادی زندگی اور خارجی حالات کا عکس زیادہ ہے، یہاں شاعر کا تمام تر سفر روحانی ہے۔ وہ ان کیفیات سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے، پہلے وہ ایک فضا طیار کرتا ہے، اس فضا میں وہ اپنے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی مدد سے پرواز کرتا ہے اور جس طرح ایک فلسفی یا ایک عبادت گزار استغراق میں اور چیزوں کو بھول کر ایک اپنی بنائی ہوئی دنیا میں چلا جاتا ہے شاعر بھی اسی دُنیا میں یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی صحیح معنوں میں صرف اسی "غیر ارضی" ماحول کی پابند ہے۔ "ارضی ماحول" تو صرف ایک عکس یا حباب کی طرح ہے جہاں اس کو ایک لمحاتی تجربے سے آشنا کرایا جا رہا ہے اور اس کا مقصد بھی اسی اصلی دُنیا کی حقیقت کے لئے ثبوت اور شہادت فراہم کرنا ہے۔

ان کیفیات کی بھی مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔ یہ اصل میں مادّی حقایق سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی فرار کے طور پر بھی پیدا ہو جاتی ہیں جس میں شاعر اس دنیا کے مکروہات سے بچنے کے لئے تخیلی مرکز کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس مرکز کے تصور میں شاعر کے خیالات پر روایتی حقیقتوں کا اس قدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ اسے بہت سی بے بنیاد چیزیں صحیح معلوم ہونے لگتی ہیں اور وہ انھیں محسوس بھی کرنے لگتا ہے جس طرح وہم میں کبھی کبھی ہمیں ایک پودا آدمی کی شکل کا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسے ہم مجسم طور پر دیکھنے لگتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ حرکت کر رہا ہے۔

آتش کی شخصیت میں چونکہ ارضی ماحول سے لگاؤ زیادہ ہے اس لئے وہ جب وجدانی تخیل کی مدد سے غیر ارضی ماحول میں پہونچتے ہیں تو وہاں بھی وہ پوری طرح تسکین نہیں پاتے اور فرار کیلئے دوسرا راستہ ڈھونڈھتے ہیں اور بالآخر پھر اپنی دنیا میں واپس آتے ہیں۔ اسی لئے ان کی اس قبیل کی شاعری میں تشکیلی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ چونک چونک اُٹھتے ہیں اور روحانی تصورات سے یا تو ہٹ جاتے ہیں یا پھر اس میں ارضیت کی آمیزش کر دیتے ہیں۔

کرے گی برق جمال اس کی بند آنکھوں کو وہ خلوتی اگر اے انجمن نظر آیا

کچھ نظر آتا نہیں اس کے تصور کے سوا حسرتِ دیدار نے آنکھوں کو اندھا کر دیا

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے، جس طرف دیکھا مقام ہُو نظر آیا مجھے

آتش مست جو مل جائے تو اس سے پوچھوں تو نے کیفیت اُٹھائی ہے خرابات میں کیا

بوئے گل آتش کہیں ہوتی ہے محسوس نظر افترا ہے روزِ محشر یار کے دیدار کا

اُٹھ چکا روزِ قیامت روئے قاتل سے نقاب عرصۂ محشر نگہ کے تیر کی منزل نہ ہو

اے موج بے لحاظ سمجھ کر مٹائیو دریا بھی ہے اسیر طلسمِ حباب کا

اُلٹا اُدھر نقاب تو پردے ادھر پڑے — آنکھوں کو بند جلوۂ دیدار نے کیا

واہ ری بے بصری، واہ ری نابینائی — صورت آباد سے مشتاق لقا جاتے ہیں

مشتاق جو ہوتا ہوں کعبہ کی زیارت کا — آنکھیں پھری جاتی ہیں طوفِ حرم دل کو

دار پر بھی مجھے کھینچیں تو انا الحق نہ کہوں — سرخ ہر چند ہو میری مئے منصور سے آنکھ

پشت بر دیوار حیرت ہیں ہزاروں حیرتیں — صاحب آئینہ خانہ آج تک روپوش ہے

تصور ہر نفس ہے پیش چشم اس روئے روشن کا — نگہباں برق کو میں نے کیا ہے اپنے خرمن کا

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی — ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

اثر رکھتی مئے گلگوں کا کیفیت کا ہستی ہے — اُبھرنے میں حباب بحر کے اک جوش مستی ہے

وجدانی تخیل سے غیر مطمئن ہو کر شاعر پھر انسانوں کی دُنیا میں واپس آتا ہے تو اسے ایک بار پھر امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ابھی ان جمالیاتی کیفیتوں کو نہیں بھول سکا ہے اور نہ ذہن سے وہ نقوش بالکل مٹ گئے ہیں اس لئے اس ماحول میں پہلے تو وہ انھیں حقایق و معارف کا سہارا لیتا ہے لیکن زندگی جب انھیں ایک دوسری صورت میں پیش کرتی ہے تو وہ اسے قبول کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے تجربات اس کے اندر بجائے تلخی یا جھنجھلاہٹ پیدا کرنے کے ایک بے نیازی اور خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں، وہ دنیا پر جب نگاہ ڈالتا ہے تو جن حقیقتوں سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ ان حقیقتوں سے اپنی ہستی کو زیادہ مکمل اور زیادہ بھرپور سمجھتا ہے۔ اس وقت شاعر نہ تو مابعد الطبیعیاتی تصورات کا سہارا لیتا ہے اور نہ تصوف کے ایمان و عقاید کا اس کے افکار پر اثر پڑتا ہے بلکہ دُنیا کو ایک دُنیا ہی میں بسنے والے آدمی کی طرح دیکھتا ہے البتہ لب و لہجہ میں رندی و سرمستی کا سا انداز اب بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تصوف اب یہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔

کوچۂ دلبر میں، بلبل چمن میں مست ہے — ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

نشۂ دولت میں منعم پیرہن میں مست ہے — مرد مفلس حالت رنج و محن میں مست ہے

دور گردوں ہے خداوندا کہ یہ دور شراب — دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

گردشِ چشم غزالاں گردشِ ساغر ہے یاں — خوش رہیں اہلِ وطن دیوانہ پن میں مست ہے

ایک ساغر دو جہاں کے غم کو کرتا ہے غلط — اے خوشا طالع جو شیخ و برہمن میں مست ہے

وحشت مجنوں و آتش میں ہے بس اتنا ہی فرق — کوئی بن میں مست ہے کوئی وطن میں مست ہے

غم نہیں ثابت قدم کو گو جہاں گردش میں ہے — قطب کو جنبش نہیں ہے آسماں گردش میں ہے

حیف ہے بے نشہ اس میخانہ میں انساں رہے — روز و شب جام مہ و خورشید ساں گردش میں ہے

پار اترے کیا سلامت بحر الفت سے کوئی
سیکڑوں گرداب اس کے درمیاں گردش میں ہے

گرد پھرنے کا ترے سودا ہوا ہے ہم کو یار،
ہر گھڑی، ہر وقت، ہر دم، ہر زماں گردش میں ہے

جستجو میں تیرے انجم کی طرح اے ماہ حسن
ذرہ ذرہ ہو کے خاک عاشقاں گردش میں ہے

گنبدِ گردوں سے نکلو جس طرح سے ہو سکے
ڈر ہے گر پڑنے کا آتش یہ مکاں گردش میں ہے

یہاں آپ کو یہ احساس ہوگا کہ آتش کو صوفیوں کے تصوف سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ ان کی اس قبیل کی شاعری کو ہم صوفی شعراء کے کلام سے مماثل کر سکتے ہیں۔ یہ تصوف وجد و سماع کے دائرے کو توڑ دیتا ہے اور آتش اس میں خود زمین کی گردشوں کا رنگ شامل کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک ایسا دور آتا ہے جب اس کی آفاقی و کائناتی شاعری کی حدیں اسی "صوفیانہ بیخودی" سے مل جاتی ہیں اور اس کی شاعری زندگی کی شاعری ہو جاتی ہے جس میں تصوف کی حیثیت محض اس کی شخصیت کے تحریبی عنصر کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثلاً اس کی عام شاعری میں اس کا اثر دیکھئے :-

۱- آئینہ سینۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
۲- غبار راہ ہو کر چشم مردم میں محل پایا
۳- ہمیشہ صورتِ ساحل ہے یاں آغوش میں دریا
۴- خاک میں مل کے بھی اس کو نہ دشمن سمجھا
۵- قد صنم سا اگر آفریدہ ہونا تھا،
۶- اک جا کہیں میں مثل ریگ رواں نہ ٹھہرا
۷- ہوا ہے رشک صورت آشنائے یار پر کیا کیا
۸- تا بتار پیرہن میں بھر گئی ہے بوئے دوست
۹- ایک سے ایک ہے تماشا رنگ
۱۰- دکھلا رہا ہے رنگ گلستاں نئے نئے
۱۱- دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
۱۲- جاں بخش لب کے عشق میں ایذا اٹھائے
۱۳- چمنستاں کی گئی نشو و نما پھرتی ہے،
۱۴- دل بہت تنگ رہا کرتا ہے،

یہ اور اسی قسم کی غزلیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں چند تصورات رچ بس گئے ہیں جو اس کے خیال کے لئے آلۂ کار بنتے ہیں اور ان کی مدد سے شاعر اپنے اظہار کے لئے ایک آسان اور خوبصورت ذریعہ تلاش کر لیتا ہے۔

آتش کے تصوف کا دوسرا حصہ اخلاقیات کے تحت آتا ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح فارسی میں سعدی اور عطار نے مذہب کے اخلاقی اصولوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی اسی طرح آتش نے بھی ان اصولوں کو نظم کر دیا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہے۔ آتش کے ان اصولوں کی حیثیت شاعرانہ ہے اس کا بندھے ٹکے قوانین سے کوئی علاقہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ قرآن و احادیث کے اقوال کا شاعرانہ قالب ہیں بلکہ عام اخلاقی قدروں کے آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں اور اسے پیش کرتے ہیں۔ یہاں ان اصولوں کو نظم نہیں کیا گیا ہے بلکہ زندگی کے تجربات سے خود نئے نئے اصول بن گئے ہیں جنھیں شاعر اس اعتماد کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ وہ غلط ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ خود ان

تمام راستوں سے گزرا ہے اور ان کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ بعض نقاد آتش کے ان اشعار کو پند و موعظہ، عبرت، شراب معرفت اور الہامی بصیرت وغیرہ کے عنوانات سے الگ الگ پیش کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ سب خیالات اور زریں اقوال ہیں جنھیں شاعر نے بزرگانِ دین سے اخذ کر کے پیش کیا ہے اور اس کا مقصد اخلاقیات کی تعلیم کے ذریعہ لوگوں کی زندگی کی رہنمائی کرنا اور انھیں اچھے اعمال درست کرنے کا طریقہ بتانا ہے لیکن یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ اس کے شاعرانہ احساس سے عدم واقفیت کی دلیل ہے ——

—— آتش کی اخلاقی شاعری میں تہذیب و معاشرت کی اخلاقی قدریں تو ضرور پیوست ہیں لیکن اصول و ضوابط نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں مذہب سے انحراف ہے، کہیں کہیں مماثلت ہے اور کہیں مذہب اور شاعر کے انفرادی احساس کا امتزاج ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اخلاقی شاعری میں آتش کے یہاں شاعرانہ احساس کہاں تک پایا جاتا ہے۔ اور ان اشعار پر جنہیں مذہب کا عنصر ہے، شاعر کی انفرادیت نے کیا اثر ڈالا ہے۔

یاد رکھنے کی جگہ ہے یہ طلسم حیرت ——— صبح کو دیکھتے ہی بھول گئے شام کو ہم

غضب ہے منزلِ ہستی میں آسائش طلب ہونا ——— ہجومِ خواب سے رہرو نے ہے آخر خلل پایا

کوہِ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی ——— ٹھیس سے کاسۂ چینی کو فغاں کرنے دو

تیرہ و تار جہاں ہو دلِ روشن ٹوٹے ——— خاطرِ دوست نہ یاں خاطرِ دشمن ٹوٹے

ماتمِ دربادلاں شادیِ تنک ظرفوں کی ہے ——— گریۂ مینا ہے باعث خندہ ہائے جام کا

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے ——— زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

ہزاروں حسرتیں جائیں گی میرے ساتھ دنیا سے ——— شرار و برق کو بھی عرصۂ ہستی سے کم پایا

ہر اک جوہر میں اس کا نقشِ پائے رفتگاں سمجھا ——— دمِ شمشیر قاتل جادۂ راہِ عدم پایا

شب کو چراغ کی نہیں رہرو کو احتیاج ——— ہر ذرہ آفتاب ہے تیری سبیل کا

عرش سے آگے ارادہ میری خاکستر کا ہے ——— دل ہے پروانہ الٰہی کس چراغِ بام کا

مر گیا ہوں جستجوئے کعبۂ مقصود میں، ——— ہے کفن پر میرے عالم جامۂ احرام کا

دنیا کو آتش ایک کے اوپر نہیں قرار ——— یہ آج، کل وہ صاحبِ طبل و علم ہوا

تا گفتنی ہے حال بہار و خزاں باغ ——— اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور تم ہوا

پایا ترا جو کہ غرق ہوا بحرِ عشق میں ——— وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

بنیادِ فسادوں کی ہے آغاز سے اس کے ——— انجامِ قیامت ہے جہانِ گزراں کا

زنجیر کا وہ غل نہیں زنداں میں اے جنوں ——— دیوانہ قید خانۂ تن سے نکل گیا

دورِ شراب حلقۂ بیرونِ در سے ہے یاں، اس بزم میں ہے مست ہر اک اپنے حال میں

حسن کی نیرنگ سازی سے عجب اس کا نہیں مست ہو ہشیار تجھ کو دیکھ کر ہشیار مست

میکدہ میں نشۂ کی عینک دکھاتی ہے مجھے آسماں مست و زمیں مست و در و دیوار مست

تو روشنیٔ عالمِ ایجاد ہو گیا، ویرانہ تیرے جلوے سے آباد ہو گیا،

دکھائی دیتی ہیں آنکھوں کو صورتیں ہر سو یہ گنبدِ فلک آئینہ کا مکاں نکلا،

نقشِ صورت کو مٹا کر آشنا معنی کا ہو قطرہ بھی دریا ہے جو دریا میں شامل ہو گیا

دکھلا کے جلوہ آنکھوں نے اک شمع نور کا گل کر دیا چراغ ہمارے شعور کا

کعبہ و دیر میں ہے کس کے لئے دل جاتا یار ملتا ہے تو پہلو ہی میں ہے مل جا تا

کون سی راحتِ جاں کی ہیں یہ آنکھیں مشتاق کر کے اندھیر ہے وہ رونقِ محفل جاتا

بھر گیا ہے اس قدر رنگِ زمانہ دیکھئے، آئینہ میں بھی نہ صورت آشنا معلوم ہو

خواب و بیداری سے یہ برگِ زیست ہو لے بیخبر لوحِ دل پر سے مٹا نقشِ امید و بیم کو

کیا نفاق انگیز ہمجنساں ہوائے دہر ہے نیند اُڑ جاتی ہے سننے سے نفیرِ خواب کو

ان اشعار کو جو مختلف جگہوں سے نقل کئے گئے ہیں پڑھئے تو آپ کو یہ احساس تو ضرور ہوگا کہ ان میں ابتدائی مقام اور نقطۂ آغاز مذہب سے حاصل کیا ہوا ہے یا شاعر کے ان خیالات پر کسی نہ کسی طرح مابعد الطبیعیاتی تصورات کی چھوٹ پڑی ہے لیکن نہ تو ان میں اصولوں کو نظم کیا گیا ہے اور نہ تصوف کے اسرار و رموز کا روحانی تجربہ ہے بلکہ ان اسرار و رموز کا منبع دنیا ہے اس لئے ان میں ایک طرف تو وہ ماورائیت نہیں ہے جو خالص تصوف کی چیز ہے، دوسرے اس میں وہ خشکی یا پند و نصائح کی سی کیفیت نہیں ہے جو مذہب کے اثر سے روایتی طور پر بعض شعراء کے یہاں داخل ہو جاتی ہے۔ ان کو اخلاقی شاعر انھیں معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اخلاقی قدروں کو سمویا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کے جذبات میں ایک طرح کی سنجیدگی توازن اور فلسفیانہ تفکر ہے اور ان تمام آلودگیوں سے پاک ہے جو اکثر عشقیہ شاعری میں راہ پا جاتی ہیں۔ اسی لئے تصوف کے شعراء کے یہاں پڑھتے وقت آپ کو یہ احساس ہوگا کہ چاہے ان کے اندر اثر اور جذبہ بہت زیادہ نہ ہو لیکن پھر بھی ایسی شاعری نہ ملے گی جن میں تہذیب و شرافت کا خون کیا گیا ہو اور اس قسم کے پست اور رکیک خیالات ہوں جنھیں سُنکر بقول آزاد شائستگی کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے۔

اس کے بعد آتش کی اخلاقی شاعری کا ایک اسٹیج اور باقی رہ جاتا ہے جو ان کی عشقیہ شاعری کے آفاقی لب و لہجے سے ذرا کچھ پہلے کا ہے۔ یعنی اس میں بھی وہی وسعت اور ہمہ گیری ہے جو عشقیہ شاعری میں اور اس میں بھی انفرادی احساس سے ہٹ کر اجتماعی شعور کا پتہ چلتا ہے لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ ان پر بھی کسی نہ کسی طرح کلچر کا اثر پڑا ہے اور روایتوں کا

خون دوڑ رہا ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے پیدا کردہ مسایل بار بار شاعر کے سامنے سوالات پیش کرتے ہیں اور وہ ان جوابات کے لئے سب سے پہلے روایتوں پر نظر ڈالتا ہے لیکن وہ روایتیں اس کو صحیح معنوں میں تسکین نہیں دیتیں اس لئے وہ ان چیزوں کو اپنے تجربات کی بھٹی میں پگھلاتا ہے اور اس کے بعد انھیں نئی صورتیں دیتا ہے۔ ان سوالات کا جواب حاصل کرنے سے پہلے شاعر کو مادی وسایل سے سابقہ پڑتا ہے اس لئے وہ کبھی کبھی اخلاقی قدروں کا ہمنوا ہوتا ہے اور جہاں کہیں وہ قدریں اس کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو خود نئے اخلاق کی بنیاد ڈالتا ہے۔ کیٹس نے انھیں معنوں میں کہا تھا کہ قوم کے اخلاق کی بنیادیں شعراء کے ہاتھوں پڑتی ہے کیونکہ شعراء اخلاق کی جذباتی اہمیت اور تجرباتی شعور سے واقف رہتے ہیں اس لئے انکے یہاں اگر صحیح معنوں میں شاعری کا مواد زندگی سے لیا گیا ہے تو اخلاق بھی ان کے یہاں مستحسن اور مذہب کی اخلاقی قدروں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی پذیر ہوگا۔

آتش کی اخلاقی شاعری کے اس حصہ کی بھی مثالیں دیکھتے چلئے :-

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ناگوار اکو جو کرتا ہے گوارا انساں،
زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل
بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے،

گنج پنہاں ہے تصرف میں بنی آدم کے
کان سے لعل، یہ دریا سے گہر لیتا ہے

ہجر میں وصل کا ملتا ہے مزہ عاشق کو
شوق کا مرتبہ جب حد سے گزر لیتا ہے

عزت نالہ و فریاد نہ کھوائے آتش
آشنا کوئی نہیں، کون خبر لیتا ہے

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

حاصل کیا ہے تو نے صدقے سے اسقدر زر
سونے کے بت بندھے ہیں بازوئے برہمن میں

دو روز ہے یہ لطف عیش و نشاط دنیا
بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

بازار مصر میں چل یوسف کا سامنا کر
کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائے گا چلن میں

صحرا کو بھی نہ پایا بغض و حسد سے خالی
ساکھو جلا ہے کیا کیا پھولا جو ڈھاک بن میں

کوئی نہیں ہے تیرا مقدور ہو تو آتش
دے رکھا جو رہ دست غسال و گورکن میں

قید ہستی سے ہنوز آزادگی حاصل کہاں
روح سے چھوٹا ہے یہ زندان آب و گل کہاں

صورت ریگ رواں گرم سفر ہوں روز و شب
کچھ نہیں معلوم جاتا ہوں کدھر منزل کہاں

جو نہ ایذا دے کوئی ایذا نہیں دیتا اسے
سایۂ دیوار کو اندیشۂ عاقل کہاں

بحرِ ہستی سا کوئی دریائے بے پایاں نہیں
آسماں نیلگوں سا سبزۂ ساحل کہاں

خندہ زن دیکھا نہ اک مردے کو زندہ کی طرح
ہوشیاری کے مزے سے آشنا غافل کہاں

عشق کے صدمے اُٹھانے کو جگر بھی چاہئے
خوں ہوا میری طرح آتش کسی کا دل کہاں

بزم میں رنگیں خیالوں کے جو ہو روشن چراغ
سنبلستاں ہو شبستاں لالۂ گلشن چراغ

یار کو بھڑکا کے مجھ سے کوئی پاتا ہے فروغ
آتش افروزی سے ہوتے کا نہیں دشمن چراغ

صبح تک چلتی ہے آہوں سے ہمارے بادتند
شام سے فانوس رکھتی ہے تہ دامن چراغ

منزلِ ہستی میں دشمن کو بھی اپنا دوست کر
رات ہو جائے تو دکھلائیں تجھے رہزن چراغ

داغ دل کی روشنی کافی ہے آتش گور میں
غم نہیں اس کا نہ ہو اپنے سر مدفن چراغ

ان غزلوں کو پڑھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے ذہن پر مسلسل کبھی کبھی اخلاقی قدریں حاوی رہی ہیں اس لئے ان غزلوں میں زیادہ تر اشعار پر ان قدروں کا اثر ہے۔ اسی سلسلہ میں بعض اشعار اخلاقی قدروں سے بالکل رشتہ توڑ دیتے ہیں لیکن انداز بیان اور نفس مضمون کے لحاظ سے وہ انھیں اشعار سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اسی لئے میں نے یہاں مثال میں بعض ایسے اشعار بھی دیدیئے جنھیں پڑھ کر آپ شاید سوچنے لگیں کہ ان کا اخلاق سے کیا تعلق، لیکن اگر ان تمام اشعار سے اسے ملا کر دیکھیں تو احساس ہوگا کہ روایتی اخلاق سے تو ان کا کوئی واسطہ نہیں لیکن یہاں شاعر نے خود ایک نئی اخلاقی قدر کی بنیاد ڈالی ہے۔

مثلاً یہ شعر:-

یار کو بھڑکا کے مجھ سے کوئی پاتا ہے فروغ
آتش افروزی سے ہوتے کا نہیں دشمن چراغ

یا عشق کے صدمے اُٹھانے کو جگر بھی چاہئے
خوں ہوا میری طرح آتش کسی کا دل کہاں

اس طرح شاعر ان حدود کو کبھی کبھی یکسر توڑ دیتا ہے اور روایتی اخلاق سے الگ ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کے اشعار کو جو جذبات کے راستے سے آکر بھی کلیہ کی صورت اختیار کرلیں ہم اخلاقی شاعری ہی میں شمار کریں گے البتہ اخلاق کا لفظ استعمال کرتے وقت ہمارے سامنے اخلاق کا ایک وسیع تصور ہونا چاہئے۔

ان اوقات کے علاوہ جب شاعر کے ذہن پر یہ تجربات و محسوسات طاری رہتے ہیں تو ایسے بھی مقامات آتے ہیں جب دوسری چیزوں کے ذکر کے سلسلہ میں شاعر اپنے تحت الشعور میں دبے ہوئے کسی تجربے سے کام لیتا ہے اور ان تجربات کو اس سلسلہ سے جوڑ کر اسے کلیے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ یہ خیالات کہیں یکجا نہیں بلکہ بکھری ہوئی شکلوں میں ملیں گے لیکن ایک خاص بات ان میں یہ ملے گی کہ جس ماحول میں وہ ہیں اسی کے پس منظر میں ان نقوش کو اجاگر کیا گیا ہے کیونکہ ان میں اسی ماحول

سے ملتا جلتا رنگ ہے مثلاً کہیں کہیں سے اس قسم کے اخلاقی اشعار چن لیجئے:-

شاہراہ ہستی موہوم میں وہ چال چل — اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیر پا

طلب دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیال آبروئے ہمت مردانہ آتا ہے

مفلس کا کام یاں نہیں دولت کا کھیل ہے — دنیا قمار خانہ ہے چلتی ہے زر کی چوٹ

دشمن بھی ہو تو دوستی سے پیش آئیں ہم — بیگانگی سے اپنی نہیں آشنا مزاج

گل ہوتے ہیں بہار چمن سے چراغ عقل — کام آستیں کا کرتی ہے گو آستیں نہیں

نہیں رہتا مزاج سفلہ ہرگز ایک حالت پر — بلندی کا بگولے کی مآل کار پستی ہے

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریئے — منزل ہزار سمت ہو ہمت نہ ہاریئے

اس قسم کے اشعار کی مقدار زیادہ ہے اور اگرچہ اس قسم کی اخلاقی شاعری کا مرتبہ بہت بلند نہیں ہے اور نہ اس میں وہ زور اور اثر ہے جو عشقیہ شاعری میں ہے لیکن اس قسم کی شاعری نے ہماری شاعری میں فحش گوئی کو کم کر کے اس میں ایک قسم کی سنجیدگی پیدا کی ہے۔

آتش کی صوفیانہ شاعری کا مرتبہ ان کی شاعری کے اس حصے سے بہت کم تر ہے جو ان کا اصل کارنامہ ہے یعنی عشقیہ شاعری جس میں غم جاناں اور غم دوراں کو سمو کر ایک نیا انداز پیدا کیا گیا ہے لیکن ان کی اس شاعری کی اہمیت اس لئے ہے کہ لکھنؤ اسکول نے جب تصوف کو بعض حالات کی بنا پر خیرباد کہدیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں سنجیدگی اور توازن باقی نہیں رہا، سوقیت اور ابتذال نے شعر و قصاید کے دفتر کو بری طرح ناپاک کیا اور لکھنؤ کے شاعروں کی غزل معاملہ بندی، انگیا اور چوٹی کی شاعری ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے وقت میں آتش نے تصوف کو اپنا کر شاعری میں ایک صحت مند رجحان کی نمایندگی کی۔ ظاہر ہے کہ وہ تصوف کی شاعری اس طرح نہیں کر سکتے تھے، جس طرح صوفیائے کرام کیونکہ عملی تصوف سے ان کو لگاؤ نہ تھا وہ جذباتی طور پر بھی ترک دنیا یا زندگی سے فرار کے قایل نہ تھے اس لئے اس تصوف میں تو وہ ناکام رہے لیکن اپنی شخصیت کے اثر سے انھوں نے لکھنؤ کی شاعری میں اخلاق کی بنیادیں استوار کیں اور اس میں ایک تہذیبی سرمائے کا اضافہ کیا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

تذکرۂ معرکۂ سخن

(اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتا)

لیکن اتفاق سے اس کی چند جلدیں اسٹاک میں مل گئی ہیں - اس لئے جن حضرات کو ضرورت ہو فوراً اطلاع دیں —

قیمت علاوہ محصول ڈاک چار روپیہ

مینجر نگار لکھنؤ

ام-ان، رائے کی مشہور کتاب

"چین کا انقلاب و جوابی انقلاب" کا ایک باب

بدیسی حملہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اجنبی ممالک کے ساتھ قدیم چین کے ربط پیدا کرنے میں جغرافی صورتِ حال مانع ہوئی، بحر اخضر مشرق میں ایک موثر روک کا کام کرتا تھا، جبکہ جہاز رانی صرف مغربی ایشیائی اور جنوبی یوروپی اقوام کو معلوم تھی، وسیع ریگستانی مقبوضات نے جو روایاتی معاند وحشیوں سے آباد تھے، مغرب میں خشکی کے ذریعہ مواصلات کو بہ استثنائے جاں باز سیاحوں کے خطرناک بنا دیا تھا، بلند ناقابل عبور پہاڑوں نے چین کو ہندوستان سے جدا کر دیا تھا، اس جغرافی علیحدگی کی صورت میں رہنے کے باعث چین کے باشندوں میں قدرتی طور پر اجنبیوں اور ملک سے باہر کی چیز کے لئے ایک قدامت پرستانہ اور مشتبہانہ انداز ترقی پذیر ہو گیا پھر بھی غیر ملکیوں کے خلاف مخالفانہ جوش جو جدید چین کی عوامی زندگی کی مخصوص نوعیت ہے، اور جو انیسویں صدی کے اختتامی ایام میں بہت سرعت کے ساتھ ابھر گیا، چین کی پچھلی تاریخ میں اس کا کہیں پتہ نہیں، اس کے برعکس قدیم چین کے روحانی بزرگوں نے اجنبیوں کے ساتھ رواداری، مہماں نوازی، اور دوستی کی تلقین کی، مسلم الثبوت کتب مقدسہ میں ایسے احکام ہیں:- "پردیسیوں پر مہربان رہو جو دور دراز جگہ سے آئیں"۔ کانفیوشس نے تعلیم دی کہ "چاروں سمندروں کے درمیان رہنے والے سب بھائی بھائی ہیں"۔ اجنبیوں کے خلاف معاندانہ جوش جدید ارتقائی چیز ہے، اور اس نے سخت برانگیختگی کے ماتحت نشو و نما پائی، یہ اہلِ یورپ کے اس سلوک کا ردِ عمل ہے جنھوں نے سولہویں صدی سے چین میں آنا شروع کیا۔

یورپ سے آنے والوں کے سلوک کے علاوہ چینی قوم کے لئے بدیسیوں سے مشتبہ اور مخالف رہنے کی اور دوسری تاریخی وجہیں ہیں ——— چین کی پوری تاریخ وحشی حملہ آوروں کو چین کی مغربی اور شمالی سرحد سے دور رکھنے کے لئے جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے چین ان تاریخی جھگڑوں میں ہمیشہ کامیاب نہ رہا پیاپے وحشی قبایل چین میں تاخت و تاراج کرتے اور چاروں طرف موت اور تباہی پھیلاتے رہے، متعدد بار ان وحشی حملہ آوروں نے ملک میں مختلف طول مدت کیلئے اپنی حکمرانی قایم کر لی، گو ان کل مواقع پر حملہ آور عاقبت الامر چینی ملت میں جذب ہو گئے، جس طرح غلام یونان نے اپنے وحشی فاتح کو غلام بنا لیا، شروع شروع ان کی آمد نے چینی ذہن پر صرف ناموافق اثر پیدا کیا، اس کے علاوہ کل حملہ آور قومیں میزان تمدن کے اعتبار سے پست تر تھیں، اس لئے قدرتی امر تھا کہ اہلِ چین کل اغیار کو اپنے سے فروتر سمجھیں، قدیم یوروپی

آنے والوں کا سلوک بہ استثنائے عہد وسطیٰ کے علمی سیاحوں مارکوپولو اور یسوعیوں[1] کے یقیناً ایسا نہ تھا جس سے چینیوں کو ممکن طور پر یقین ہوتا کہ آنے والے ایسی قوموں کی نیابت کرتے ہیں، جو کم از کم انھیں کی طرح متمدن ہیں۔

یہ قدرتی امر تھا کہ چینیوں نے سارے بدیسیوں کے مقابلہ میں برتری کا اندازہ اختیار کر لیا، تاتار، ہنس، مغول، اور اسی طرح کی قومیں جن سے وقتاً فوقتاً سولھویں صدی تک ان کو ربط و اتصال رہا مسلمہ طور پر کمتر درجہ کی تہذیب کی مالک تھیں اسی طرح کا انداز ساری قدیم قوموں میں پایا جاتا ہے، جنھوں نے اپنے اپنے تمدن کو بہت ہی قلیل ربط باہمی سے نشو و نما دیا لیکن جب کبھی کسی بدیسی آنے والے میں مختلف انداز کا وصف پایا گیا تو چینیوں نے بڑی وقعت کے ساتھ اس کی پذیرائی کی، مثلاً اطالوی سیاح مارکوپولو کو قبلہ خاں اعظم کے دربار میں باریابی کی اجازت ملی اور اس کو ایک معزز مقام دیا گیا بہت سے مسیحی مبلغوں کو اس کی حکومت کے آخری ایام اور منچو حکومت کے ابتدائی دور میں بلند سرکاری مناصب حاصل تھے۔ وہ اہل یورپ جو سولھویں صدی اور اس کے بعد ساحل چین پر اترے، بہت ہی کمتر درجہ کی ثقافتی سطح سے تعلق رکھتے تھے، یہ جانباز تھے، اور یورپی سوسائٹی کے ارادل میں ان کا شمار تھا، اور انھوں نے مشکل ہی سے وحشیوں کی بہ نسبت کوئی بہتر فعل کیا، ایک انگریز نوآبادیاتی سرکاری ملازم نے جسے چینیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی، لکھا ہے:۔ "مغرب کے بحری سیاحت کرنے والے بدیسی جو بہ حیثیت جانبازوں اور شورش پسندوں کے پہلے پہل چین کے بحری تختہ پر قدم رکھتے ہیں وہ معروف و مشہور براعظمی (یورپی) اقوام کے بہت سے اوصاف رکھتے تھے" اور وہ معذرت کرتے ہوئے رقمطراز ہے "چینیوں کو کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ یہ لوگ ایک بڑے اور شائستہ فرقہ کے غیر تربیت یافتہ ترین ارکان میں شامل ہیں اور انھوں نے دریافت کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ وہ نمونے جو ان کے سامنے موجود تھے ان کی مشابہت سطحی چیز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔" لیکن تاریخ جانتی ہے کہ ان سمندری جانبازوں اور شورش پسندوں کے سلوک کو محض ایک سطحی ناشائستگی ہی سے تعبیر نہیں کر سکتے، جس کے لئے اہل چین زیادہ رواداری کا ثبوت دے سکتے بلکہ یہ ابتدائی شہنشاہیت کی حملہ آورانہ پالیسی کی نیابت کرتا تھا، چین کے باب میں یورپی حکومتوں اور ان کے رفیع الشان نائبوں کا سلوک اکثر بہت زیادہ غضب آفریں تھا اور یہ مشکل ہی سے چینیوں پر کوئی اچھا اثر ڈال سکتا تھا۔

بڑے بڑے جغرافی موانع کے باوجود قدیم چین کو بہت قدیم زمانہ سے اس عہد کے متمدن ممالک سے ربط تھا[2]، بائبل میں "کیتھے" کے ساتھ تجارتی تعلقات کا تذکرہ ہے، قبل مسیحی سال کی آخری صدیوں میں چین کے شہنشاہ مختلف تجارتی کاروبار کرنے والے ممالک میں اپنے سفیر بھیجا کرتے تھے، جہاں وہ آبدار موتی، جواہرات، قیمتی پتھر، پیلا سونا اور بہتیرے دوسرے اشیاء

---

[1] یہ فرقہ نے ۱۵۳۴ء میں قایم کیا تھا۔ یہ عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے۔

[2] اطلبوا العلم ولو بالصین کی سند ضعیف ہی کیوں نہ ہو لیکن امام بیہقی جیسے نقاد حدیث اس متن کو "مشہور" بتاتے ہیں اس سے ہر چند عرب اور چین کی دوسری ظاہر کی گئی ہے لیکن غور کرنے سے تمدن چین کی طرف اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

حاصل کرتے، دوسری صدی قبل مسیح میں رومی شہنشاہ مارقوس آریلیس کے سفیر کا چینی دربار میں گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور دونوں ممالک کے درمیان پُرامن تجارتی تعلقات قایم ہوگئے، جغرافی حالات کی حد بندیوں کے تحت چین اور بحیرۂ روم کے ممالک کے درمیان پرامن خاصا تجارتی سلسلہ صدیوں تک قایم رہا ساتویں صدی میں شام کے نسطوریوں کو چین میں نہ صرف پناہ ملی بلکہ ایک میہمان نواز وطن مل گیا، جہاں انھوں نے بلا کسی مزاحمت کے اپنا دین پھیلایا، صرف اُنیسویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں برطانوی سفیر البتہ چینی دربار میں اپنی جگہ نہ لے سکے، اور آگے چلکر انھوں نے بے رحمانہ فوجی اقدامات ذریعہ تجارتی حقوق زبردستی حاصل کئے۔

سنہ مسیحی سے بہت قبل ہندوستانی اور ملایا والے چین کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے، آٹھویں صدی میں عربوں نے مشرق بعید میں آنے کے لئے سمندری رستہ کا پتہ لگالیا تھا[1]، عربوں اور بدھ مذہب کے ہندوستانی مبلغوں کو چین میں آزادانہ داخلہ کی اجازت دیگئی، آخرالذکر سیکڑوں برس قبل بحری رستہ سے وہاں اپنے جدید مذہب کی تبلیغ کے جوش میں آچکے تھے، کینٹن سمندر پار کی تجارت کا ہنگامہ خیز مرکز بن گیا مسلسل ساتویں صدی اور سترھویں صدی کے درمیانی زمانہ میں بے انتہا بدیسی تجارت وہاں سے انجام پاتی تھی، دنیا کے قدیم ترین مساجد میں سے ایک مسجد کینٹن میں اب بھی موجود ہے، جہاں عرب پہلے پہل فروکش ہوئے اور جہاں سے انھوں نے صدیوں تک تجارت کا چاق چوبند سلسلہ جاری رکھا۔

چین کی آبادی کروروں مسلمانوں پر مشتمل ہے، ان پر اپنے اعتقاد کے لئے کبھی کسی قسم کا جور وجفا روا نہ رکھا گیا، یہ دوسرا ثبوت ہے کہ چین پرامن بدیسیوں کے لئے ہمیشہ روادار رہا ہے، جب تک ان کی آمد ایک بالادستانہ کبریائی، وحشیانہ بے رحمی، اور فتوحات کے لپکے پر مشتمل نہ ہوگئی مسیحیت کی اشاعت ممنوع نہ تھی، یہاں تک کہ مشرق بعید میں پوپ کی سلطنت کی قیادت کے لئے کیتھولک مذہب کی داخلی عداوت لیسوعیوں اور ڈومینکی راہبوں کی نزاع کی شکل میں چین کے اندر رونما ہوئی، لیسوعیوں نے دیسی مذہبی اداروں میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور انھوں نے خود کو تعلیمی کام میں مشغول رکھا، یہ کام جب کسی تہ میں چھپی ہوئی غرض کے لئے نہیں بلکہ عملی طور پر انجام پذیر ہوجائے، تو یہ روایاتی اوہام سے مقابلہ کرنے میں ایک موثر ذریعہ ہے، اسی وجہ سے انھوں نے خود کو چینیوں کی نظر میں محبوب رکھا، وہ ملک میں عام طور پر ہردلعزیز ہی نہ تھے، بلکہ انھوں نے شاہی دربار میں بھی اپنے ہم مذہب بنالئے، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ منگ خاندان کے زوال کے وقت شاہی گھرانہ کے ایک سو سے زیادہ ارکین نے لیسوعیوں کی تبلیغ کے مطابق عیسائیت قبول کرلی تھی، ایک زمانہ میں مشاہدین کو معلوم ہوتا تھا کہ چین رومن کیتھلک بن جائے گا منچو خاندان نے بھی لیسوعیوں کی حفاظت و سرپرستی کی اس کے بعد چین میں لیسوعیوں اور ڈومینکی راہبوں کے درمیان سخت لڑائی

---

[1] حضرت انس سے اطلبوا العلم ولو بالصین کی جو مرفوع حدیث مروی ہے اور جس کو ابن عدی نے المدخل میں اور بیہقی نے "شعب" میں وصل کیا اس سے معلوم ہوتا ہے عرب آٹھویں صدی سے قبل چین کے بحری رستہ سے واقف ہوچکے تھے، فرشتہ نے ملیبار کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی سے قبل عرب یہاں آچکے تھے۔

شروع ہوگئی آخرالذکر کو جو زیادہ قدامت پرست اور یسوعیوں کے مقابلہ میں بضاعت علمی کے لحاظ سے کمتر درجہ رکھتا تھا پوپ کی اعانت حاصل ہوئی اور اس نے فوقیت حاصل کرلی، چین میں مغلوں کو جو مراعات حاصل تھی، اس کا انھوں نے غلط استعمال شروع کیا، انھوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت کے لئے اپنی مذہبی آزادی کا استعمال شروع کیا، مسیحی قومیں نظام سرمایہ داری کے اسٹیج پر بہت زیادہ ترقی یافتہ تھیں اور ان میں شہنشاہیت کی امنگوں کا ظہور ہو رہا تھا، کلیسا ابتدائی شہنشاہیت کا پیش خیمہ بنا، مبلغوں کے کھلم کھلا سیاسی مقصد نے اٹھارھویں صدی میں نہ صرف چین بلکہ جاپان سے بھی ان کو خارج البلد کرا دیا لیکن عیسائی مبلغوں کا اخراج حملہ آورانہ مقصد کی راہ میں ایک موثر رکاوٹ نہ بن سکا جس مقصد کو لیکر یورپ سے آنے والے ساحل چین پر ظاہر ہوئے تھے، عربوں نے آٹھ صدی قبل ہی چین کے بحری رستہ کا پتہ لگالیا تھا کیپ آف گڈھوپ سے چکر لگاتے ہوئے ہندوستان سے چلتے ہوئے انھوں نے ملاکا پر قبضہ کرلیا، جو حکومت چین کا باجگذار تھا، قدرتی طور پر حملہ کے اس فعل نے چینیوں پر کچھ اثر نہ ڈالا، ایسے آغاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یہ یقین کرلیں کہ نئے آنے والے پرامن تجارت کی غرض سے آئے ہیں، پرتگالی جب کینٹن میں آئے، تو ان کو حملہ آوروں کی حیثیت سے دیکھا گیا اور اس حیثیت سے ان کا دلی خیر مقدم نہ ہوا، اس پر انھوں نے گستاخانہ طور سے سلوک کیا اور خوش خلقی و تقریبات کے اس روایاتی چینی تصور کی بے حرمتی کی جس کا ایک بدیسی آنے والے کو میزبان کے یہاں پہونچنے میں پابند ہونا چاہئے، ہندوستان میں اپنی حکومت قایم کرنے اور اس کے بعد ملاکا فتح کرنے کے بعد پرتگالیوں نے چینیوں کے مقابلہ میں متکبرانہ انداز اختیار کرلیا تھا، انھوں نے چینیوں کی بے حرمتی کی اور ان کے ساتھ دردناک سفاکی کا سلوک کیا، اس جدید قسم کے وحشیوں سے سابقہ رکھنے کے عادی نہ ہونے کے باعث چینی افسروں نے حکم دیدیا کہ بدیسی آنے والوں کو تین دن تک مسلمانوں کی مسجد میں تقریبات کی تعلیم دیجائے پرتگالیوں نے بہت ہی تکلیف دہ انداز میں اس غیر مضر حکم کی نافرمانی کی، دارالسلطنت میں اہانت آمیز سلوک کے باعث ترجمان کو پھانسی دیدی گئی اور زمرہ کے بقیہ حصہ کو ملک بدر کرنے کے لئے قید کرکے کینٹن بھیجدیا گیا، کھلم کھلا اپنے ہی قصور کے لئے کینٹن سے نکال باہر ہونے کے بعد پرتگالیوں نے چین پر اپنا حملہ شروع کیا، انھوں نے جزیرہ نما ملایا کو اپنی طویل حرکت و عمل کا مرکز قرار دیا پہلی مرتبہ چین آنے کے راستہ میں ملاکا فتح کرنے کے باعث چینیوں کا ان کی نیتوں کو مشتبہ نگاہ سے دیکھنا غلط نہ تھا، آہستہ آہستہ نامبارک آنے والوں نے اپنے برتر جنگی اسلحہ جات کی بدولت کامیابی حاصل، اور امائے فوچو اور کینٹن میں اپنے قدم جمالئے لیکن پھر بھی وہاں انھوں نے غیر رواداری کا ایسا سلوک کیا کہ جزیرہ نما مکاؤ میں محصور ہوکر رہ گئے، جدید یورپ کے ساتھ چین کے ابتدائی روابط کا مختلف تجربہ یسوعی مبلغوں کے ذریعہ اور آخر میں پرتگالی تاجر فاتحوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے کہ آنے والوں کے سلوک نے چین کے انداز کی تعیین کی، اہل یورپ نے تجارت پر قانع نہ رہ کر پہلے ہی سے دیسی لوگوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا، فوقیت پسندانہ طریقے اختیار کئے اور تجارتی مراکز کے لئے شہروں اور زمین پر دست تصرف دراز کیا، اسی سبب سے آنے والوں کے متعلق جن کے مقاصد اس قدر کھلم کھلا معاندانہ تھے، اہل چین کا رویہ دوستانہ نہیں رہ سکتا تھا۔

پرتگالیوں کے بعد ہسپانوی آئے غیر یوروپی اقوام کے مقابلہ میں ان کی رعونت اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی، ان کا رویہ پیداوار تھا میکسیکو، پیرو اور بعد میں جزایر فلپائن کی فتوحات کا اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہسپانویوں نے مینیلا کے چینی آباد ہونے والوں کو بہیمانہ طور پر قتل کر ڈالا تھا ان کا چین میں کچھ خیر مقدم نہ ہوا، چین کے متعلق ان کے ارادے پرتگالیوں سے بھی کمتر کامیاب رہے، ڈچ بھی جو ہسپانویوں کے بعد آئے، اپنی مہم میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے، ۱۶۲۲ء میں انھوں نے اماے پر قبضہ کرنا چاہا لیکن بھگا دئے گئے اس کے بعد وہ فارموسا کے اس جزیرہ میں آباد ہوئے جہاں سے انھوں نے اپنی توجہ جاپان کی طرف مبذول کی، اس کے بعد ہندوستان میں حکومت کے لئے انگریزوں کے ساتھ لڑائی اور ملایا مجمع الجزایر کے قبضہ کے لئے لگاؤ نے ڈچوں کو ترغیب دیا کہ وہ چین کو قطعی طور پر چھوڑ دیں، چین میں باضابطہ یوروپی حملہ کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ انگریز منظر عام پر آئے گو انگریز تاجروں نے ساحل چین پر سترھویں صدی کے آغاز ہی سے آنا شروع کر دیا تھا اور انھوں نے اپنے قانون کے زیر سایہ ایک مختصر سی نوآبادی قایم کر لی تھی، ان لوگوں نے آپس میں صلاح کر کے کوئی طے شدہ فعل آنے والی صدی کے آخری حصہ سے قبل شروع نہیں کیا، اُن دو سو سال میں انگریز امریکہ نوآبادی قایم کرنے اور ہندوستان کے فتح کرنے میں مشغول رہے وطن میں وہ جدید شہنشاہیت کی بنیاد ڈال رہے تھے، جب آخر کار انھوں نے اپنی توجہ چین کی طرف مبذول کی، انگریز اس کام کیلئے اپنے سابقین یعنی پرتگالیوں، ہسپانویوں، اور ڈچوں سے زیادہ موزوں تھے، انھوں نے چین میں اپنا عمل بہ حیثیت نجی جانبازوں کے چھاپہ مارنے والے اور جوا، لیکر بھاگ جانے والے زمروں کی حیثیت سے نہیں شروع کیا، بلکہ ایک شہنشاہیت پرست قوم کے نائبوں کی حیثیت سے جس کو وطنی حکومت کی پوری امداد حاصل تھی، ہندوستان فتح کر کے انھوں نے چین میں اپنی مہم کی کامیابی کے لئے سابقہ فضا پیدا کر دی تھی، چین کے لئے دوسری سخت مصیبت اُس کے ساتھ اس کا تعلق تھا، جس کا آغاز سترھویں صدی کے آخری حصہ میں ہوا، منگ خاندان کے زوال، اور منچو حملہ نے ملک کو بدنظمی میں ڈبو دیا تھا، ان حالات سے فایدہ اُٹھا کر روس نے چینی مقبوضات پر متصرف ہونے کی سعی کی، ۱۶۸۹ء میں دونوں ممالک کے درمیان نرسنسکی کے بیچ بچاؤ سے لڑائی کا خاتمہ ہو گیا پطرس اعظم کے تحت روس کی نگاہ مغرب کی طرف پھر گئی، اور اس کی قوتیں داخلی مسایل پر مرکوز ہو گئیں اس وجہ سے چین کے ساتھ دوستانہ تعلق ہو گیا اور دونوں ممالک کے درمیان ایک برومند تجارت کو فروغ ہوا، لیکن اُنیسویں صدی میں روس نے پھر اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کی اور وہ چین میں بدنیتی حملہ کے عمومی پالیسی کا رہنما عنصر بن گیا، دو سو برس تک چین اور یوروپی اقوام کا تعلق تشنجی رہا جو قطعی طور پر یہ چین کے لئے مضر نہ تھا سیاسی طور پر یورپ سے آنے والوں کے ساتھ اہل چین کا شبہ اور عناد اچھی طرح سے جم گیا عام طور سے تجارت پر پابندیاں قایم کرنے کے لئے حکمراں طبقات کی پالیسی کی رہنمائی ملک کی عمرانی بناوٹ کے ذریعہ ہونے لگی۔

جاگیردار امرا یعنی دیسی منگ خاندان، اور حملہ آور منچوؤں کے یکساں سیاسی اقتدار کے قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا چین کے حکمراں طبقہ کی اس رجعت پسندانہ پالیسی نے چین میں تجارتی حق محفوظ کرنے کے لئے یورپ والوں کو تشدد کا استعمال

کرنے کے لئے ظاہری جواز دیا، یوروپی طریق کار کو کسی دوسرے بہانہ سے جایز قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ تیز فہمی مدعا کے طور پر چینی وسایل معاش سے رجعت پسند جاگیر دار گرفت کو ہٹانے کے لئے ایک آلہ کا انقلابی مفہوم پیدا کرتی، اگر یوروپی حملہ آور آگے چل کر انقلاب کی دیسی طاقتوں کے خلاف جاگیر طبقہ کی حمایت نہ کرتے، چین میں یوروپی حملہ آوروں کی پالیسی یہ تھی، کہ وہ ہر دلعزیز تغیرات عظیم کے خلاف مثلاً ٹیپنگ بغاوت، باکسر بغاوت، انقلاب ۱۹۱۱ء کے بعد جمہوریت کے لئے نزاع اور عہدِ حاضر کے قومی انقلاب کے خلاف جاگیر دار حکمراں طبقہ کے زمانہ کی حمایت کرتے، جاگیر دار حکمراں طبقہ سے کھینچ تانکر وہ غیر معمولی حقوق حاصل کرتے، اور تب ان کے زوال پذیر اقتدار کے قیام کے لئے ان کی مدد کرتے، تاکہ بدیسی لوگ اپنی مراعاتی حیثیت پر قانونی صورت میں بحال رہ سکیں، اور جنتا سے بہیمانہ حد تک فایدہ اُٹھاتے رہیں، اس حیثیت سے یوروپی متوسط شہری طبقہ کے نائبوں نے چین کے جاگیر دار سرقبیلی حکمراں طبقہ پر حملہ نہیں کیا، انھوں نے اسی حد تک اس پر حملہ کیا جس حد تک اس نے تجارتی پھیلاؤ میں رکاوٹ پیدا کی، جیسے ہی ان کو جو کچھ وہ چاہتے تھے، مل جاتا وہ چینی حکمراں طبقہ سے متحد ہو جاتے کیونکہ صرف ایک مخالفانہ ٹولی ہی کے ذریعہ وہ خاص حقوق و مراعات حاصل کرتے تھے، اس لئے جدید سرمایہ دارانہ تجارت کے ذریعہ چین میں داخلہ کا انقلابی مفہوم نتیجہ کے اعتبار سے بالمقابل وزن رکھتا ہے، زوال پذیر جاگیر دارانہ، نیم سرمایہ دارانہ قومی وسایل دولت پر بدیسی شہنشاہیت کی مدد سے ملمع سازیاں کی گئیں۔ (باقی)

عبدالمالک آروی

شامِ اودھ

(ناول)

مصنفہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ام۔اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

جس میں بلدۂ حسن و شباب اور سرزمین نغمہ و رنگ یعنی لکھنؤ کی اس معاشرت کی دلچسپ تصویر پیش کی گئی ہے، جس پر ساری دُنیا نے رشک کیا۔ اگر شاہان اودھ کے محل خانوں کی رنگ رلیاں، بیگموں کی زبان، لکھنوی محاورے اور مشرقی تمدن کے ڈوبتے ہوئے سورج کی شفقی رنگینی دیکھنا ہے تو اس ناول کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

حجم ۲۷۴ صفحات۔ مجلد۔ معہ رنگین گرد پوش۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ (صہ ر)

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

غالب کی شخصیت

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن پھر بھی کم ہے - ان کی شخصیت اور شاعری کے بہت سے گوشے اب بھی تاریکی میں ہیں اور اگر تاریکی میں نہیں تو اچھی طرح روشن نہیں ہوئے ہیں - ہر بڑے شاعر کی شخصیت اس کے کلام میں جھلکتی ہے - بڑے شاعر اس لئے کہ چھوٹے شاعر در اصل شاعر نہیں نقال ہیں - صدا اور گونج ہیں - دوسروں کی نقل اُتارتے ہیں اور ان کی آواز کی حکایت کرتے ہیں - بڑا شاعر اپنی فطرت سے شاعر ہوتا ہے - اس کا کلام اس کی فطرت کا پرتو ہوتا ہے - اس کی طبیعت کی لہر ہوتا ہے - اس کے باطن کا جوش ہوتا ہے - اس لئے اس کی پوری شخصیت اس کے آئینۂ کلام میں جھلکتی ہے -

غالب بڑا شاعر تھا - اس لئے اس کی شخصیت کا پرتو ہمیں اس کے کلام میں نظر آنا چاہئے - شخصیت کی تعمیر میں مزاج اور ذہن دونوں کو دخل ہے - اس میں دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں - کہیں اعتدال کے ساتھ اور کہیں بے اعتدالی کے ساتھ - کسی شخصیت میں مزاج اور اس کی خصوصیات کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں ذہن و فکر کی امتیازی صفات کا غلبہ ہوتا ہے - پہلی قسم کی شخصیتیں سطح حیوانی کے برابر ہیں - دوسری قسم کی شخصیتیں اس سطح سے اسی قدر بلند ہوتی ہیں جتنا یہ غلبہ شدید ہوتا ہے - پہلی قسم کی شخصیتیں انفعالی ہیں اور دوسری فعلی - غالب کی شخصیت میں فکری عنصر کا غلبہ ہے - انکا یہ فکری عنصر ان کے کلام میں جھلکتا ہے - غالب کی شخصیت ایک اعتبار سے فکر و احساس کے لئے نبرد گاہ ہے - شاعر کا احساس قدرتی طور پر شدید ہوتا ہے - غالب کے یہاں شدت احساس کے ساتھ ذکاوت ادراک بھی ہے - آلام روزگار سے وہ جہاں متاثر ہیں وہاں ان کا فکر انھیں مردانہ وار ان آلام کے مقابلہ کی دعوت بھی دیتا ہے - وہ ان آلام کے سامنے سپر نہیں ڈالتے - بلبلے کی طرح بیٹھ نہیں جاتے - خس بے مایہ کی مثال ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بہتے نہیں چلے جاتے - وہ ڈٹ کر مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں - بے قدری کی شکایت، مصائب کا بیان، یاران وطن کی بے مہری کا ذکر یہ سب کچھ ذکاوت حس کی وجہ سے ہے شعور کی بیداری کی وجہ سے ہے - غالب مزاج کے اعتبار سے عصبانی ہیں - ان کے عصبات میں ستار کے تاروں کا سا ارتعاش ہے - جو معمولی سے تصادم سے تھرتھرانے لگتے ہیں - غالب کی شخصیت کا یہ ایک پہلو ہے - ان کی شکایت میں شکر، یاس میں آس، اور افسردگی میں جوش ہے -

غالب بڑی شخصیت کے مالک تھے - ان کی عظمت کا راز ان کی غیر معمولی فکری صلاحیتوں میں ہے - ان کی شخصیت فعلی ہے - انفعال غالب کے نزدیک "زبونئ ہمت" ہے -

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

عام طور پر فعلی شخصیتیں "انانی" ہوتی ہیں۔ انانیت انسانی فطرت کا سب سے زیادہ تاب ناک جوہر ہے۔ یہ اثبات خودنمائی ہے۔ تعمیر خودی ہے اور بقول اقبال :۔ "تعمیر خودی میں ہے خدائی"

غالب خود بیں ہیں، خود پسند ہیں، آزاد ہیں۔ خود بینی سے عزتِ نفس، خود پسندی سے غیرت، اور آزادی سے خود داری پیدا ہوتی ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب کے کلام میں یہ تمام جوہر ہیں۔ وہ انسان کی عظمت اور اس کی فطرت کے بے پایاں امکانات کے قایل ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وہ اس کی ذلت و خواری دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں :۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

کسی نے اورنگ زیب سے شکایت کی کہ خان فیروز جنگ اپنی مثل کسی کو نہیں سمجھتے۔ اورنگ زیب نے جواب دیا :۔ "یوں کہو کہ اپنی مثل کسی کو نہیں دیکھتے" غالب کو بھی فیروز جنگ کی طرح اپنا ہمسر نظر نہیں آتا۔ غالب کے فن میں ایک انفرادی شان ہے۔ ان کے شعر میں جدت ہے۔ ان کے انداز فکر میں انوکھا پن ہے۔ ان کے طرز ادا میں بداعت ہے۔ یہ سب کچھ ان کی خود پسند طبیعت کے کرشمے ہیں۔ وہ پامال راہ پر چلنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان، ان کا بیان، ان کی تشبیہیں، ان کے استعارے، ان سب میں ایک نئی کیفیت، ایک نیا جوش، ایک نئی آن ہے۔ وہ ہر باب میں جدت کے شیدائی ہیں۔ ہر صنف میں انھوں نے نئی راہ نکالی ہے۔ مدح سرائی اور نوحہ گری کر کے غزل سے انھوں نے قصیدے اور مرثیے کا کام لیا ہے۔ ان کے قصیدے بھی عام شاہ راہ سے الگ ہیں جو قصیدہ گوئی کے ایک نئے امکان کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ غالب "پابستگیِ رسم و رہ عام" سے نفور اور پابندیٔ "رسوم و قیود" سے آزاد ہیں۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں پابستگیِ رسم و رہ عام بہت ہے
تجھے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب جدت پسند ہی نہیں دقت پسند بھی ہیں۔ ہر کس و ناکس اگر ان کے اشعار کی تہ تک پہونچ جائے تو انکا کلام اس مقام سے گر جائے جہاں وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ان کی ہمت دشوار پسند عشق کی دشوار منزلیں ہی طے کرنا چاہتی ہے۔

ہے نوآموزِ فنا ہمت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

ان کی شخصیت کا جوہر ارادے کی پختگی اور عقیدے کی استواری ہے۔ یہ صفت بڑی شخصیتوں میں پائی جاتی ہے۔ ایمان اسی استواری کا نام ہے۔ محبت میں وفاداری کی شرط اولین بھی یہی استواری ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بُت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب نے یوں تو آہ کی بے اثری اور نالے کی نارسائی کا ذکر بھی کیا ہے۔ عام شعراء کی طرح وہ بھی "حاصل اُلفت" "شکست آرزو" ہی بتاتے ہیں۔ ان کے دل سے بھی ہوائے کشت و فا مٹ چکی ہے۔ اور کوئی امید بر آتی نظر نہیں آتی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ مایوسیوں سے مغلوب نہیں ہوتے۔ وہ حق الیقین کے مقام میں فرماتے ہیں :۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں

عشق ایک جذبۂ آتشیں ہے۔ غالب نے اس جذبے کا جس انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس کی ویرانہ آفرینی، تباہی و بربادی، تن کاہی و زیاں کاری کو جس ڈھنگ سے دعوت دی ہے اس سے ان کی شخصیت کی بلندی کا پتہ چلتا ہے :۔

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

غالب کے عشق میں جو خود داری ہے، غیرت ہے، عزت نفس ہے اس کی مثال عرب کی شاعری کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ ان کے عشق میں وارفتگی ہے بے چارگی نہیں۔ بے خودی ہے سپردگی نہیں۔ برشتگی ہے فسردگی نہیں۔ غالب نے عشق و محبت کا ایک بلند معیار پیش کیا ہے۔ اس میں ان کی وضعداری کا رنگ موجود ہے :۔

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ایک اور شعر ہے :۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غالب کا عشق فرشتوں کا سا پاک بازانہ اور معصومانہ عشق ہے۔ نہ اس میں خوشامد ہے، نہ تذلل ہے، نہ بے ادبی ہے، نہ بے حیائی ہے، ایک ہی غزل کے دو شعر سنئے :۔

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیوں کر ہو

کہتے ہیں کہ غالب کے کلام میں سوز و گداز کی کمی ہے۔ اس کی وجہ بھی ان کے عشق کی معیاری شان ہے۔ ان کا عشق فدویت و بے چارگی سے پاک ہے۔ اس میں ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور ایک خاص قسم کا بناؤ ہے۔ وہ اپنے محبوب سے روٹھتے بھی ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ان کا عشق مردانہ ہے۔ عورتوں کی طرح لٹھوے بہانا۔ بات بات پر شکوے شکایتیں کرنا ان کی شان کے خلاف ہے۔

تمنائے زباں محو سپاس بے زبانی ہے — مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا
شکوہ سنج رشک ہمدگیر نہ رہنا چاہیئے — میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آستانا

ان کی گریہ وزاری شکوۂ بے داد نہیں تقاضائے جفا ہے۔

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں، — ہے تقاضائے جفا شکوۂ بے داد نہیں

فغان و فریاد شکوہ و شکایت کے خیال سے عشق کی رسوائی ہے۔

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں فغاں کیوں ہو

ہاں دل دکھنے پر دو چار آنسو نکل پڑنا ناچار ہے۔ دل ہے پتھر کا ٹکڑا تو نہیں ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

عشق میں ذلت و خواری خود دار عاشق کی شان نہیں۔ وہ سب کچھ گوارا کر سکتا ہے لیکن عشق کی رسوائی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ خود داری اور سپردگی کے درمیان ایک توازن قایم رکھتا ہے۔ برق کی عبادت بھی کرتا ہے اور حاصل کا افسوس بھی اس کے عشق میں معشوق کی سی آن بان ہوتی ہے۔ نیاز میں ناز ہوتا ہے اور بے خودی میں ہشیاری۔ اس مقام کو عشق میں تسلیم کہتے ہیں :-

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

نزاکت اور عجز کا تقابل ملاحظہ کیجیے :-

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

عشق کی آبرو ریزی ہے کہ اس کی جفائیں عام ہوں اور اس میں قدح خوار کے ظرف کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ آفتاب کی شعاعیں سنگ و آئینہ میں فرق کرتی ہیں۔ آئینہ شعاعوں سے روشن ہو جاتا ہے لیکن سنگ بدستور تیرہ و تار رہتا ہے۔

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
گرتی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

غالب کی ہر ادا نرالی ہے۔ اس کی شاعری میں معشوق کی سی نزاکت اور عاشق کی سی جاں سپاری ہے معشوق حسن و رعنائی میں بے مثال ہے اور عاشق قہر و غضب اٹھانے میں۔ دونوں میں انفرادیت کی شان ہے۔

درخور قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

خود داری کا یہ حال ہے کہ کسی کا بار احسان اٹھانا وبال ہے :-

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

اس کے لئے رنج نومیدی جاوید بھی گوارا ہے۔

رنج نومیدیِ جاوید گوارا رہیو — خوش ہوں گر ناوکِ دلدوز کشِ تاثیر نہیں

دوائے درد اور تاثیر نالہ و فریاد ہی نہیں بلکہ توقیر درد کے لئے بھی کسی کا منت کش ہونا ناگوار ہے۔

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیر درد — زخم مثل خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی — گوشِ منت کشِ گل بانگ تسلی نہ ہوا

غالب فراری نہیں عالی ہمت ہیں۔ علو ہمت کا تقاضا ہے کہ عشق کے کڑے سے کڑے وار خندہ پیشانی کے ساتھ سہے جائیں۔ وہ اس میدان کے مرد ہیں۔ دکھ درد میں مسکراتے، آزار سے لذت اٹھاتے، اور فتنوں سے دل بہلاتے ہیں۔ چند شعر سنئے:۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

نام کا ہے مرے وہ دکھ جو کسی کو نہ ملا — کام کا ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

بے نیازی کی یہ شان ہے کہ بندگی میں خدائی کر رہے ہیں۔

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

بے خودی کا یہ عالم ہے کہ فرشتے سجدہ ریزی کرنے پر مجبور ہیں۔

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

عشق و محبت ہماری غزل کا خاص باب ہے۔ محبت میں خواری غزل کا خاص جوہر تھا۔ غالب نے اسکو خودداری سے آشنا کیا۔ اس میں جلال کا رنگ بھرا۔ فرشتوں کی معصومیت اور پاکبازی کی شان پیدا کی۔ سوز کی جگہ ساز، گداز کی جگہ شگفتگی، اور افسردگی کی جگہ درد کوری۔ عشق کا آب و رنگ یہ مردانہ صفات ہیں۔ غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی پوری شخصیت سمودی ہے۔ ان میں وہی وقعت، خودداری اور بے نیازی پیدا کردی ہے۔ غالب کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ۔ انسانیت کا آئینہ اور انسانیت کے اعلیٰ جذبات کی جھلک ہے۔ اس میں فطرت کے جوہر چمکتے ہیں۔ وہ ہمیں اس مقام پر لے جاتا ہے جہاں سے فرشتے کوتاہ نظر آتے ہیں۔ یہ انسانیت کا مقام ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

غالب کے رشک کا ذکر ہر زبان پر ہے۔ رشک غیرت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس چراغ کی بڑھی ہوئی لو ہے غیرت خود انسانیت کا پھل ہے۔ پختہ، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل۔ مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ درخت

اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ انانیت کی پہچان، اس کی عظمت و برتری، اس کے تابناک جوہر کی شناخت غیرت سے ہوتی ہے۔ غیرت غالب کی شخصیت کا ایک ہیجان ہے، اس کے طوفاں خیز لہروں کی ایک مچلتی ہوئی لہر ہے، اس کے بے شمار خطوط میں سے ایک ٹیڑھا میڑھا خط ہے۔ اس کے پیچھے ایک عمق ہے، ایک صلاحیت ہے، ایک رفعت ہے۔ یہ غالب کی شخصیت ہے۔

غالب کی شخصیت طلب، طمع، حرص و آز، اور زبونی ہمت سے پاک ہے۔ غنچے کی طرح وہ شبنم کے چند قطروں پر قناعت نہیں کرتے۔ وہ اس زہد کے منکر ہیں جو ریائی ہے۔ انھیں اس زہد سے بھی نفرت ہے جس میں پاداش عمل کی طمع خام ملی ہوئی ہے۔ ثواب طاعت کو جانتے ہیں لیکن پست فطرت لوگوں کی طرح اس لالچ میں عبادت نہیں کرتے کہ جنت کی نعمتیں ملیں گی۔ گدائی ان کی خو نہیں۔ فقر ان کا فخر ہے۔ بے نیازی ان کا شعار ہے۔ ان کا نعرہ مستانہ ہے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شوکت سبزواری

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنی

"من و یزداں" کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفانِ نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ۔ یونس اور دہانِ ماہی ۔ حُسن یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علمِ غیب ۔ وحی کی حقیقت ۔ دُعا و توبہ ۔ لقمان ۔ عالمِ برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت ماروت ۔ حوضِ کوثر امام مہدی ۔ نورِ محمدی اور پُل صراط ۔ آتشِ نمرود ۔ علامۂ مشرقی اور قبلہ کا رُخ ۔ دُعا و توبہ کی حقیقت ۔ نفس و روح ۔ آدم اور شجرِ ممنوع ۔ لفظ امّی کا صحیح مفہوم ۔ معاد وغیرہ ۔ ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید و دبیز ۔

قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے ۔ ——— منیجر نگار لکھنؤ

امریکہ کا سبز باغ

اس وقت ہمارے سامنے امریکہ ایک ایسا سبز باغ ہے جس کی بہار کا تصور کر کر کے ہم بے چین ہوئے جا رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم بھی امریکہ ہی کی طرح ترقی کریں تو ہمیں وہی تمام نعمتیں حاصل ہو سکتی ہیں جو اہل امریکہ کو میسر ہیں۔ لیکن ہم کبھی ایک لمحہ کے لئے یہ نہیں سوچتے کہ امریکہ دولتمند ضرور ہے لیکن خوشحال نہیں - وہاں اس میں شک نہیں کہ سونے چاندی کے ڈھیر ضرور لگے ہیں، لیکن اطمینان و سکون کسی کو نصیب نہیں -

دُنیا نے جس چیز کو گم کر دیا ہے، وہ قلبی و روحی مسرت ہے، نفس و ضمیر کا اطمینان ہے اور بدقسمتی سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ کھوئی ہوئی دولت ہم کو زر ہی کی مدد سے مل سکتی ہے، صنعتی ترقی ہی سے میسر آ سکتی ہے، اور اس کا معیار ہم نے امریکہ کو سمجھ رکھا ہے - لیکن خود اس جنتِ ارضی کا کیا حال ہے، ذرا اس کو بھی دیکھ لیجئے -

سوویٹ نیوز ایجنسی نے ای ولادوف کا ایک مقالہ شایع کیا ہے جس میں اس نے امریکہ کی موجودہ اقتصادی و معاشی زبوں حالی پر روشنی ڈالتے ہوئے ظاہر کیا ہے کہ:-

امریکہ کے مشہور ماہر معاشیات رابرٹ ہیل برونر نے اپنے ایک مضمون میں جو "ہارپرس میگزین" میں شایع ہوا تھا صاف طور سے ظاہر کیا ہے کہ آج امریکہ کے کروروں انسان اپنے مستقبل کے متعلق کس قدر فکرمند ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دس برس کی گرم بازاری کے بعد جو امریکہ کی تاریخ میں مسلسل ترقی کا طویل ترین دور تھا، اب کاروباری لوگوں، تاجروں، مزدوروں، اور ملازمین سب ہی کو معاشی تباہی کا کھٹکا لگا ہوا ہے -

امریکی سرمایہ داروں کے ترجمان "جرنل آف کامرس" نے معاشی صورتِ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ کاروباری سرگرمیوں میں تنزل بالکل حقیقی ہے - ایک اور جریدہ "یونائیٹڈ اسٹیٹس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ" نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے - اس کا بیان ہے کہ پچھلے دسمبر میں پیداوار میں جو کمی ہونا شروع ہوئی تھی اس کی رفتار کچھ عرصہ سے اور تیز ہو گئی ہے،

جہاں تک امریکہ کے کروروں مزدوروں، کسانوں، چھوٹے چھوٹے کلرکوں کا تعلق ہے وہ بڑھتے ہوئے معاشی بحران سے خوب باخبر ہیں۔ امریکہ کے ایک ترقی پسند صحافی اے۔ چیپامین نے بتایا ہے کہ بے روزگاروں کی تعداد تقریباً پچاس لاکھ تک پہونچ گئی ہے، گزارہ کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے، کارخانوں میں کام کی تیز رفتاری کے قاعدوں پر سختی سے

عمل شروع کر دیا گیا ہے اور اب کل کا کسی کو بھروسہ نہیں رہ گیا ہے۔ اور یہ معاشی بحران کی ابتدا ہے۔

پچھلے سال کے آخری حصہ اور ۱۹۴۹ء کے ابتدائی حصہ کے سرکاری اعداد و شمار بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ معاشی بحران آرہا ہے اور امریکی نظام معیشت پاش پاش ہوتا جا رہا ہے۔ صنعتی پیداوار مجموعی طور پر دس فیصدی کم ہو چکی ہے۔ مکانات کی تعمیر کا کام آدھا رہ گیا ہے۔ جوتوں کی پیداوار میں ۲۴ فیصدی کی کمی ہو گئی ہے اور کوئلہ کی پیداوار میں ۱۶ فیصدی کی۔ سوتی کپڑے کی پیداوار ۲۰ فیصدی کم ہے۔

معاشی تنزل سب سے زیادہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام صنعتوں میں سرمایہ لگانا بہت ہی کم ہو گیا ہے ——— اور امریکی سرمایہ دار زیادہ سرمایہ لگانے سے اس لئے احتراز کر رہے ہیں کہ وہ مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن ہیں۔

تجارتی حلقوں میں بھی معاشی بحران کے آثار عیاں ہیں۔ مال کے ذخیرے بڑھتے جا رہے ہیں اور خریداروں کا کہیں پتہ نہیں مال تیار کرنے والے کارخانوں میں ۳۲ ارب ڈالر کی مالیت کے ذخیرے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اب امریکہ کی برآمد ۲۳ فیصدی کم ہو گئی ہے۔ اشیاء کی قیمتوں میں یک لخت کمی اور دیوالیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد جسے امریکی اخبارات نے تسلیم کیا ہے وہی مایوس کن نقشہ پیش کرتی ہیں۔ جو ۳۳-۱۹۲۹ء کے زبردست معاشی بحران کے زمانہ کا تھا۔ امریکہ میں کروروں مزدور اور ملازمین بے روزگار ہو گئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے بموجب جنھیں بہت کم کر کے بیان کیا گیا ہے ان کی تعداد ۳۲ لاکھ بتائی جاتی ہے، لیکن امریکی مزدور سبھاؤں کے بیان کے مطابق یہ تعداد ۵۰ لاکھ تک پہونچ چکی ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ ۵۰ لاکھ تندرست مزدوروں کو کوئی روزگار نہیں مل سکتا اور ان کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک کروڑ بیس لاکھ مزدور جو صرف وقتی کام کرتے ہیں، ان میں سے بھی اکثر کو ہفتہ بھر میں صرف ایک سے ۱۴ گھنٹوں تک کا کام ملتا ہے۔ اور ان کی معاشی حالت بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ اور ٹرومین کے اقتصادیاتی مشیر کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ امریکہ میں مہنگائی کی وجہ سے لاکھوں گھرانے اپنا خرچ نہیں چلا سکتے ——

اگرچہ ۱۹۴۸ء میں امریکی کمپنیوں کی آمدنیاں ۱۹۳۹ء کی بہ نسبت ۴۰۰ فیصدی زیادہ تھیں، پھر بھی امریکی سرمایہ داروں نے اجرتوں میں عام کمی کرنے اور مزدوروں کی کارکردگی بڑھانے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ مثلاً جنرل موٹرس کمپنی نے حال ہی میں اجرتیں ۲ سینٹ فی گھنٹہ کم کر دیں اور پیداوار کا کوٹا ۲۵ فیصدی بڑھا دیا۔ کارگزاری بڑھانے کی پالیسی کو سخت کر دینے کی وجہ سے صنعتوں میں حادثات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ محکمہ محنت کے اعداد و شمار کے بموجب ۱۹۴۸ء میں ۲۰ لاکھ حادثات ہوئے ان کی وجہ سے ۱۶۵۰۰ مزدوروں کی جانیں ضایع ہوئیں اور ۹۰ ہزار مزدور مستقل طور پر اپاہج ہو گئے۔

فروخت ہو رہی ہے

مولانا آزاد کے الہلال کی دوسری جلد مکمل ۔ اور الہلال جدید کی پہلی جلد مکمل۔

عبدالحمید نعمانی ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳ ۔ راولپنڈی

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی

دہلی کی بے سروسامانی لکھنؤ کی آبادی کا باعث ہوئی - وہاں کا سرمایۂ ادب بھی لکھنؤ منتقل ہوگیا - لیکن طویل مسافت دیرینگی ماحول نے اس کو اپنے تراشیدہ سانچوں میں ڈھال لیا اور لطافتِ شعری کو ایسی مضحکہ خیز آرایش سے گرانبار کردیا جو کہ تاریخِ ادب میں ایک یادگار المیہ رہیگا - محاورہ بندی، زبان کے اشعار، حد رسوائی تک عریاں خارجیت، زباں دانی کے فلک پیما دعوے اور دوسروں کو اس سلسلہ میں اپنا دست نگر سمجھنا - یہ اس دبستاں کی خصوصیات قایم ہوئیں - جس کے نتیجہ میں غزل کچھ عجیب چیز ہوکر رہ گئی — جب بھی اس اسکول کا کوئی شاعر ان مفروضات سے گریزاں ہوا تو خواہ اہلِ لکھنؤ نے اس کو جہلِ مرکب سمجھا لیکن وہ شاعر ہوا حقیقی معنی میں شاعر -

نظر آنجہانی بھی لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور اس ماحول کے پروردش یافتہ لیکن ان تمام بدنام خصوصیات سے مبرا، غزلگو شاعر تھے لیکن ان خانہ ساز موروثی روایتوں سے محترز، یہ وہ دور تھا کہ لکھنؤ کا اپنا رنگ شباب پر تھا - ہندوستان کے دوسرے گوشوں سے اس واجد علی شاہی سکۂ رائج الوقت کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی تھیں، لیکن لکھنؤ میں کوئی بھی شاعر اس سے روگش نہ ہوا تھا - تبدیلی ہوئی تھی تو صرف اتنی کہ اگر پہلے رعایتِ لفظی و ایہام کے چار کارنامے ہوتے تھے تو اب دورہ گئے تھے اور پہلے جہاں صرف "رنگ رنگیلا" سماں ہوتا تھا وہاں اب کچھ "سوگوار" انداز بھی ملنے لگا تھا - بڑے بڑے معرفن کاران سنگریزہ ہائے صنم آفریں سے گراں دامن تھے - اور کس کو کہا جائے جبکہ عزیز جیسا مقتدر شاعر موت، جنازۂ دمرثیہ کے مضامین کے انبار لگا رہا تھا اور غالب کی تقلید میں بوجھل تراکیب وژولیدہ خیالی کی چٹانیں تراش کر بزعمِ خویش اولمپس کی بلندیوں پر کمند افگن تھا - ایک نمونہ ملاحظہ ہو :-

رہنے دو کہ ہے قابلِ عبرت مرا گھر بھی — آئے گا کبھی تو کوئی سیاح ادھر بھی
واعظ ہے صراط آپ کی گو بال سے باریک — دیکھا ہے کبھی جادۂ ناسورِ جگر بھی

اور ثاقب جیسا شاعر ایسے شعر کہنا فخر سمجھتا تھا کہ :-

تم دیکھ لو چھپ کر مجھے ہوگی نہ خبر بھی — وہ زخم ہے دل میں جو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
چپ دیکھ کے خوش دل نہ سمجھ اہلِ جہاں کو — ظالم ترے کردار سے دبتی ہے خبر بھی

یہ تھا آن حضرات کا ترقی مآب انداز - مسلسل ایک بدلا ہوا رنگ کسی کے یہاں نہیں ملتا جس کو سعیِ اصلاح سے تعبیر کیا جاسکے، جس کی خاص وجہ ایک یہ بھی تھی کہ لکھنؤ کی شاعری سے بغاوت یا اس کی اصلاح ہر شخص کے بس کی نہیں جہاں یگانہ جیسے افراد خاک میں ملا دئے جاتے ہوں صرف صدائے مخالفت بلند کرنے پر، جہاں کسی شخص کی ایک غلطی اس کی ساری خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہو اور جہاں

کے قلم بدست حضرات فتوائے عدم زبان دانی ہر وقت زبانِ قلم پر رکھتے ہوں وہاں کوئی منفرد انداز پیدا کرنا "کارے دارد" جہاں کے باکمال آج بھی ایسے شعر کہنا معراجِ کمال سمجھتے ہوں کہ:-

دل تو جبھی ہم دیں گے کہ جب ان گالوں کا اک بوسہ دو ورنہ ہے خالی باتیں بنانا، لینا ایک، نہ دینا دو (آرزو)

کیا پھر تم نے روتے دیکھ کر دیدار کا وعدہ پھر اک بہتے ہوئے پانی میں بنیادِ مکاں رکھ دی "

لاکھ رو کا نکل پڑے آنسو وہ کڑی چوٹ دل پہ کھا بیٹھے (اثر)

جس کو ہوائے یاس نہ اب تک بجھا سکی اس لعلِ شب چراغ کی قیمت نہ پوچھئے (سراج)

وہاں اگر کوئی "آتش صفت" شاعر پیدا ہو جائے تو تعجبات سے ہے۔

نظر کا یہی کارنامہ ہے۔ انھوں نے ایسے دور میں ماحول سے ستیزہ کار ہو کر داخلیت و تاثر کو پوری طاقت سے پیش کیا۔ لکھنؤ کی بے جان شاعری میں میر کی روح سمونے کی کوشش کی۔ محبت کے مرتعش نغمات کو جو لکھنؤ کے تصنع آلودہ ماحول میں اپنی صلاحیت و تاثیریت کھو بیٹھے تھے صداقتِ شاعرانہ کا لہجہ دے کر حقیقت سے ہم آہنگ کیا۔ اس وقت جبکہ خود لکھنؤ والے لکھنؤ پناہ میر و لکھنؤزاد آتش کو بھول چکے تھے ان کی آوازِ شعر نے صدائے بازگشت کا کام کیا اور لکھنؤ کے گم کردہ راہ ادیبوں کے سامنے صحیح راستہ پیش کیا ان کے کلام میں کہیں بھی تاثر و صداقت کا فقدان نہیں کہیں بھی تباین و مغایرت نہیں ایک ہموار ویکسانگ نغمہ ہے جو مختلف آوازوں میں زیر و بم کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔

نظر اپنے معاصرین سے اسی لئے ممتاز ہیں کہ انھوں نے ماحول و پسند زمانہ کو بالکل نہیں دیکھا۔ مذاقِ عامیانہ کی پیروی کر کے فتوائے استادی و سخنوری لینا گوارا نہیں کیا بلکہ روحِ شاعری کو اپنایا، سستی شہرت سے روکش ہو کر لطافتِ خیال و صداقتِ بیان کی اقلیم پر تصرف کیا۔ یہ ضرور ہے کہ نظر کو اس کی قیمت بہت گراں ادا کرنا پڑی، یعنی لکھنؤ نے اپنا روایتی سلوک دہرایا۔ ان کی شاعری کی طرف سے ایسی آنکھیں پھیر لیں جیسے کہ وہ شاعر ہی نہیں تھے۔ صدہا متشاعروں کو نمایاں کیا لیکن نظر کا نام لینا بھی توہینِ ادب سمجھا، آج آپ کو وہاں کی محفلوں میں سب کا تذکرہ ملے گا ان کا بھی جو کہ کسی اعتبار سے بھی اس کے مستحق نہیں لیکن انکا نام کسی عنوان کے تحت بھی نہ آئے گا جیسے کہ اس نام کا کوئی شاعر وہاں گزرا ہی نہیں۔ حد یہ ہے کہ اگر آج کوئی شخص انکا مجموعۂ کلام دیکھنا چاہے تو نہیں دیکھ سکتا، صرف زمانہ وغیرہ رسایل کے پرانے فایل اس کے امانت دار ملیں گے۔

کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس شخص کا دیوان تک مرتب نہ ہو سکے جو صحیح معنی میں لکھنؤ کے لئے نشانِ راہ تھا اور اصلاح کی ابتدا کرنے والا ایسے شاعر کا ضمنی طور پر بھی تذکرہ نہ آسکے جو مذاقِ عام سے گریزاں تھا اور میر کا معتقد اگر قاسم چاندپوری دہلی سے اور فانی بدایوں و حیدر آباد سے نالہ کش رہے اور شکارِ بے لہری تو نظر و یگانہ کی ناقدری بھی لکھنؤ کی جبین پر یادگار داغ رہے گی اور اہلِ لکھنؤ کی وسعتِ قلب کی مشرح داستان۔

ترقی یافتہ ادب یا ادیبوں سے قطع نظر ہمیں ان افراد کی قدر کرنا چاہئے جنھوں نے کہ ترقی کے راستے متعین کئے یا کسی بگڑے ہوئے

رنگ کے خلاف اصلاح کی رہنمائی کی۔ سودا، غالب، حالی، اقبال و حسرت وغیرہ اسی بنا پر قابلِ عظمت ہیں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ نظر کے زمانہ میں لکھنؤ کا طرۂ امتیاز خارجیت و الفاظ پرستی تھی جس کی مثالوں کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جس طرح کوک شاستر کا نام لیتے ہی اس کا مفہوم ذہن نشین ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح لکھنوی رنگ کا ذکر آتے ہی اس کا نقشہ سامنے آجاتا ہے مختصر طور پر یوں سمجھئے جیسے کسی غیر متمدن قوم کی ایک عورت کو بالکل برہنہ کر کے بازار میں کھڑا کر دیا جائے اور اس کی عریانیت کو کم کرنے کے لئے مرصع زیور سے آراستہ کر دیا جائے۔

ایسے دور میں نظر نے یہ راگ چھیڑا کہ :-

فنا ہونے میں سوزِ شمع کی منت کشی کیسی
جلے جو آگ میں اپنی اسے پروانہ کہتے ہیں

ابھی مرنا بہت دشوار ہے غم کی کشاکش سے
ادا ہو جائے گا یہ فرض بھی فرصت اگر ہو گی

معاف اے ہم نشیں گر آہ کوئی لب پہ آجائے
طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ دردِ جگر ہو گی

مجسم داغِ حسرت ہوں، سراپا نقشِ عبرت کا
مجھے دیکھو یہی انجام ہے آخر کو اُلفت کا

جہاں میں چار دن رہ کر فقط بوئے وفا دینا
گلوں سے میں سبق لیتا ہوں آئینِ محبت کا

سنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ
ہاں ایک نگاہِ غلط انداز ادھر بھی

نظر کی اوائل عمر میں جلال و اسیر کے نغمے گونج رہے تھے، ان کے بعد عرصہ تک امیر مینائی نے سعادتمندانہ جانشینی کا حق ادا کیا۔ مستند حلقوں میں اس کے خلاف جذبۂ مذمت پیدا ہو گیا تھا۔ نظر نے اس میں اصلاح کی ابتدا کی۔ خارجی مرصع سازی کو نظر انداز کر کے داخلیت، اثر آفرینی و سادگی پیدا کی۔ ان کے یہاں وہ بلندی و تنوع اور جوش و تخیل تو نہیں جو غالب و مومن کے یہاں ہے لیکن وہ سادگی و درد ضرور ہے جو میر و درد کا سرمایہ ہے، نظر کی زبان میں بے حد لوچ ہے اور طرزِ ادا میں بلا کا سوز و گداز ہر شعر اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے ایسا اثر جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ " از دل خیزد و بر دل ریزد " ملاحظہ ہو :-

سن لو کہ رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے
ہے اک زبان گویا شمعِ سحر نہیں ہے

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

یوں تو دل کو کبھی قرار نہ تھا
اب بہت بے قرار رہتا ہے

دل کی حالت نہیں بدلنے کی
اب یہ دنیا نہیں سنبھلنے کی

بس ایک نظر اور کہ اب ختم ہے قصہ
پھر ہو گی نہ تم کو مرے مرنے کی خبر بھی

ہوئی ہے کیا جانے کیا برائی قفس سے پاتے نہیں رہائی
گلوں کی بو تک اُڑ کے آئی، ادھر کی شاید ہوا نہیں ہے

ان اشعار میں کتنا تاثر ہے اور بیان میں کتنا سوز، پہلے شعر کا طرزِ تخاطب کتنا متاثر کن ہے، اگر بجائے " سن لو " کے دوسرا لفظ آتا تو شاید یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ پامال سا مضمون ہے لیکن پیرایۂ بیان کی سادگی نے کتنا حسن پیدا کر دیا۔ دوسرے

شعر کا آخری مصرعہ حسرتِ ناکامی کی کیسی منہ بولتی داستان ہے خصوصاً بیشتر کا لفظ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک عمر بسر ناکامی کرنے کے بعد انتہائے یاس میں آپ بیتی سنا رہا ہے ——— آخری شعر کو دیکھئے "ادھر کی شاید ہوا نہیں ہے" کتنا پر حسرت بیان ہے، دل کو سمجھانے اور خود کو تسلی آمیز فریب دینے کی کتنی سچی ترجمانی ہے۔ انتہائے نامرادی میں عام طور پر تقدیر کو ذمہ دار ٹھہرا کر دل کو تسکینِ ناتمام دیجاتی ہے، یہ کیفیت قریب قریب ہر شخص پر طاری ہوتی ہے لیکن نظر پر ساری عمر یہی عالم گزرا معاش و معیشت کے اعتبار سے ساری عمر روحانی صدمے اُٹھاتے رہے۔ یہ جاننے کے بعد اس شعر کی صداقت اور زیادہ ہو جاتی ہے اگر بغور تجزیہ کیا جائے تو بہت سے دلوں کی دھڑکنیں اس مفہوم سے ہم آہنگ ملیں گی۔

اتنی ہی رہ گئی ہے اب کائنات دل کی دیکھو گے جب تم آکر کچھ اضطراب ہوگا

"کچھ اضطراب ہوگا" اس جملہ کی کیا داد دیجا سکتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تجزیہ و تنقید کی طاقتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور ہم صرف ایک کیف و وجدان میں ڈوب جاتے ہیں۔ پڑھتے ہیں، بار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار اہتزازِ نو سے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں "دیکھو گے جب تم آکر کچھ اضطراب ہوگا" اختصار و ایجاز کا اتنا سادہ و پر کار انداز ہے جس کے سامنے بڑی بڑی مشرح داستانیں بے معنی ہیں، چند سادہ سے لفظ ہیں لیکن کتنے پُر معنی، ایک بات کا مختصر سا بیان ہے لیکن کتنی خوں شدہ تمناؤں کا آئینہ دار۔

کائنات کے جملہ مظاہر حسنِ فطرت کے انعکاسات ہیں۔ حسنِ مطلق کی یہ کثرتِ جلوہ ایک سلسلۂ غیر منقطع ہے ——— جس کی بوقلمونیوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جتنا بھی اپنی فکر و نظر سے کام لیتے ہیں اتنا ہی نیرنگیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ صاحبِ نظر خیرگیِ تماشا سے چلا اُٹھتے ہیں کہ "ما عرفناک حق معرفتک" اور باخبر اعتراف کرتے ہیں کہ:-

تواں در بلاغت بہ سحباں رسید نہ در کنہہ بے چونِ سبحاں رسید (سعدی)

شعراء کا یہ بڑا محبوب موضوع ہے خوب خوب طبع آزمائیاں کی گئی ہیں خصوصاً اصغر مرحوم نے تو ایسے تمام موضوعات کو اپنایا ہے لیکن دیکھئے کہ نظر نے بھی کس خوبی سے سیدھی سی بات میں اس کیفیت کو بیان کر دیا ہے فرماتے ہیں کہ:-

نہ ہوئی جلوہ گہِ ناز کی وسعت معلوم گو میں ہر ذرہ کو ایک دیدۂ حیراں سمجھا

تباہی دل کی دیکھی ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے ہو اب کیسی ہی بستی ہم اسے ویرانہ کہتے ہیں

میر کا شعر آپ نے پڑھا ہوگا کہ:-

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

میر ملک سخن کے تاجدار تھے۔ ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے دل کی تباہی کو لشکر گزرنے سے پیدا ہونے والی بربادی سے تعبیر کرنا وہ عمیق کیفیت ہے جس پر بڑے سے بڑا منکر بھی وجد کر اُٹھے گا۔ اس شعر کے بعد اس شعر کے بعد اس مفہوم کو بیان کرنا

منھ چڑھانے کے مترادف ہوتا، لیکن دیکھئے کہ نظر نے بھی ایک رخ انداز بیان سے پیدا کرلیا۔ فطرتِ انسانی ہے کہ جب کوئی حادثۂ عظیم رونما ہوتا ہے تو وہ دل و دماغ پر کچھ ایسے نقوش مرتسم کر دیتا ہے جو کبھی محو نہیں ہوتے ——— اور بڑی سے بڑی مسرت ناپائدار معلوم ہوتی ہے ——— دل جو حاصلِ کائنات ہے جب وہ ویران ہوگیا تو گویا کل کائنات ویران ہوگئی ہر چیز پر سوگوارانہ کیفیت نظر آئے گی اور ہر منظر اُجڑا ہوا معلوم ہوگا دنیا جس کو نویدِ انبساط کہے گی وہ اس کی نظر میں نوحۂ ماتم ہوگا یہ نفسیاتی حقیقت ہے جس کا کہ دوسرا نام یاس یا قنوطیت ہو سکتا ہے نظر نے جس طریقہ سے اس کی ترجمانی کی ہے اس سے کہ سننے والا تھوڑی دیر کے لئے اسی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غم خواری نہیں — سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں
عشق کی ناکامیوں نے اس قدر کھینچا ہے طول — میرے غم خواروں کو اب یارائے غم خواری نہیں

"سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں" اس بات کو اگر زیادہ زور دار الفاظ میں بیان کیا جاتا تو شاید یہ وارداتی خلوص نہ پیدا ہو سکتا۔ محبت کی کارفرمائیوں کا کتنا صحیح بیان ہے۔ الفاظ و مفہوم میں باہم کتنی تطبیق و مناسبت ہے جتنا لطیف مضمون ہے اتنے ہی سادہ الفاظ۔ اور شاعر کی وہبی صلاحیتوں کا آئینہ دار۔ دوسرے شعر میں فطرتِ انسانی کے ایک ایسے پہلو کو بیان کیا ہے جس کا کہ ہم اکثر و بیشتر مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ دوست کتنے ہی غمخوار ہوں اور احباب کتنے ہی مسیحا صفت لیکن غم و آلام کے تسلسل و بے پناہ تسلسل سے سب اُکتا جاتے ہیں، نوشتۂ تقدیر و طبیعت مشکل پسند کے الزامات قرار دیکر اعلان بیزاری شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خونِ تمنا اور مصائب کی بہتات اچھے اچھے یارانِ وفادار کو دور کھڑے ہو کر اظہارِ تاسف سے آگے نہیں جانے دیتی اس شعر میں اس فطرتِ انسانی کی طرف کتنا بھرپور اشارہ ہے "میرے غمخواروں کو اب یارائے غمخواری نہیں" جذبات کو الفاظ میں بایں طور منتقل کر دینا ہر ایک کا کام نہیں۔

نظر کے کلام کی ایک وہ خصوصیت جو انھیں اپنے معاصرین سے بلند تر کر دیتی ہے یہ ہے کہ تمام کلام میں ابتذال و رکاکت کی ایک مثال بھی نہیں مل سکتی، ایک شعر بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں مذاقِ عامیانہ کا شائبہ بھی ہو، حد یہ ہے کہ کوئی غزل ایسی نہیں ملے گی جس میں ایک بھی شعر بھرتی کا ہو اور اپنے معیار سے گرا ہوا ایک پیرایۂ بیان بھی ایسا نہیں ملے گا جو کہ اس زمانہ کے رنگ سے ملتا جلتا ہو، کہیں بھی وصل و ہجر کا سوقیانہ بیان نہیں ملے گا اور ایک جگہ بھی مہمل استعارات و فرسودہ تخیلات کا پرتو نہیں نظر آئے گا۔ یہ وہ خوبی ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سلاست و محاکات کے دھوکے میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اچھے اچھے شعرا نہ بچ سکے، مولانا حسرت جیسا مجددِ تغزل کبھی کبھی یہ کہہ بیٹھتا ہے کہ:-

یوں حالِ دل ہم ان کو سنانے میں لگے ہیں — کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

لیکن نظر کی یہ "پاکئی داماں" قابل صد آفریں و صد ہزار آفریں ہے، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:-

قفس سے چھٹ کے ہوا باغ باغ دل کیسا — بہار دے گیا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

خزاں انجام ہے سب کی بہارِ چند روزہ کا — بہت روتا ہوں صورت دیکھ کر گلہائے خنداں کی

پردہ اُٹھا دے اک دن تو اے حجابِ ہستی — پاتا ہوں اس کو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے

آتے آتے رک گیا ہے دم جو مجھ دلگیر کا — آہ بھر کر منتظر ہوں آہ کی تاثیر کا

وہ ایک تم کہ سراپا بہار و نازشِ گل — وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

زمیں پہ لالہ و گل بن کے آشکار ہوا — چھپا نہ خاک میں جب حسنِ خود نمائے بہار

تعلقِ گل و شبنم ہے رازِ الفت بھی — انھیں ہنسائے جہاں تک ہمیں رلائے بہار

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے

مرنے پہ جسمِ خاکی کیا ساتھ روح کا دے — راہِ عدم میں غافل گردِ سفر نہیں ہے

بے ساختگیِ جوشِ جنوں داد طلب ہے — چل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا

قدرت کی ستم ظریفی بھی عجیب عجیب شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے، نظر جیسے شاعر کا دیوان مرتب نہ ہونا بھی اسی کا ایک کرشمہ ہے، آج صدہا دواوین ایسے موجود ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو کوئی حرج نہ ہوتا لیکن نظر کا دیوان جس کو ہونا چاہئے تھا موجود نہیں۔ مشہور مقولہ ہے کہ ہندوستان مردہ پرست ملک ہے، لیکن کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ نظر کے ساتھ اس مردہ پرستی سے بھی دریغ کیا گیا۔ ناقدری و ارزاں فروشیِ اسلاف کے بہت سے کارناموں میں یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا۔

آج اگر اس مایۂ ناز شاعر کا کل کلام ہوتا تو نہ معلوم کیا کیا مرقعے دیکھنے میں آتے، اگر کوئی شخص قدیم رسایل کی ورق گردانی کرے تو زمانہ، العصر، ادیب، خدنگ نظر اور مخزن کے پرانے پرچوں میں یہ نقوش ماتم بے کسی کرتے ہوئے ملیں گے، لیکن کس کو ضرورت ہے؟

خدا بھلا کرے مولانا حسرت موہانی کا کہ انھوں نے اپنے "انتخابِ سخن" میں کچھ اشعار جمع کر دئے ہیں جن سے کبھی کبھی ان کا نام زبانوں پر آتا رہے گا۔ اس کے علاوہ نہ معلوم کتنا کلام ہوگا کہ ضایع ہو گیا افسوس!!

ایک جگہ اوپر میں نے کہا ہے کہ ان کی غزلیں سرتاپا یک رنگ ہوتی ہیں جن میں کہ حشو و زوائد کا گزر نہیں اس سلسلہ میں کچھ اشعار سنئے یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ لکھنؤ کے دیگر شعراء کے دواوین میں اگر تین ہزار شعر کسی دیوان میں ہوں گے تو مشکل سے سو شعر اچھے نکلیں گے اور وہ بھی "مراعاتِ خصوصی" کے بعد:۔

سوزاں غمِ جاوید سے دل بھی ہے جگر بھی — اک آہ کا شعلہ کہ اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

وہ انجمنِ ناز ہے اور رنگِ تغافل — یاں مرحلۂ آہ بھی، اندوہِ اثر بھی

وہ شمع نہیں ہیں کہ ہوں اک رات کے مہماں — جلتے ہیں تو بجھتے نہیں ہم وقتِ سحر بھی

جینے کے مزے دیکھ لئے تیری بدولت — اب او دلِ ناکامِ تمنا کہیں مر بھی

اپنی شبِ ہجراں میں نہیں دخلِ تغیر
باطل ہے یہاں فلسفۂ شام و سحر بھی

سنتا ہوں کہ خرمن سے ہے بجلی کو بہت لاگ
ہاں ایک نگاہِ غلط انداز ادھر بھی

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غم خواری نہیں
سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

ہر قدم پر باغِ عالم میں بچھا ہے دامِ حسن
کون ایسا ہے جسے ذوقِ گرفتاری نہیں

میری صورت دیکھ کر کیوں تم نے ٹھنڈی سانس لی
بے کسوں پر رحم آئینِ ستمگاری نہیں

ہر طرف سے یہ صدا آتی ہے ملکِ حسن میں
یہ وہ دنیا ہے جہاں رسمِ وفا جاری نہیں

بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شئے دہر کی
عالمِ رویا میں فرقِ خواب و بیداری نہیں

اس کو رحم آئے کہاں یہ نا امیدی میں امید
دل کو خوش کرنا ہے شغلِ گریہ و زاری نہیں

سوادِ شامِ غم سے روح تھراتی ہے قالب میں
نہیں معلوم کیا ہوگا جو اس شب کی سحر ہوگی

قفس سے چھوٹ کر پہونچے ہم دیوارِ گلشن تک
رسائی آشیاں تک کس طرح بے بال و پر ہوگی

خموشی کیا مری تھی، کیوں زباں تک رازِ دل آیا
یہ کیا معلوم تھا فریاد اپنی بے اثر ہوگی

فقط اک سانس باقی ہے مریضِ ہجر کے تن میں
یہ کانٹا بھی نکل جائے تو راحت سے بسر ہوگی

کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مصحفی و آتش کا امتزاجی رنگ پایا جاتا ہے جس میں حادثات و افتادِ طبع سے شدتِ تاثیر پیدا ہوگئی ہے اور جسنے کہ ان کو کہیں کہیں میر سے قریب کر دیا ہے۔

نظر نے کچھ نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ صرف غزل کے شاعر تھے۔ قدرت نے ان کے اندر صلاحیت شعری بڑی فراخدلی سے ودیعت کی تھی۔ جس کو ان کی ناکام زندگی نے اور زیادہ اُجاگر کر دیا۔

ان کا نام نوبت رائے تھا، نظر تخلص، لکھنؤ کے رہنے والے، قوم کے کایستھ، ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں رخصت ہوگئے، ۱۸۸۴ء میں آغا مظہر کے شاگرد ہوئے جن کا سلسلۂ تلمذ استاذ الاساتذہ مصحفی تک پہونچتا ہے۔ کمالِ فن اور دولتِ دُنیا دونوں بیک وقت بہت کم افراد کو میسر آتی ہیں، ذوق و داغ جیسے خوش نصیب بہت کم ہوتے ہیں۔ نظر بھی مثل دیگر اربابِ کمال کے ساری عمر معاش کی اُلجھنوں میں مبتلا رہے، وقت اگرچہ آسانی سے کٹا لیکن اطمینان ایک پل نصیب نہ ہوا۔ قلم پر معاش کا انحصار تھا۔ ۱۹۰۷ء میں رسالۂ خدنگ نظر نکالا جو، سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند ہوگیا ۱۹۰۵ء میں منشی دیانرائن نگم نے زمانہ کے اسٹاف میں شامل کر لیا۔ ۱۹۰۸ء میں انڈین پریس الہ آباد چلے گئے وہاں سے رسالۂ ادیب نکالا۔ ۱۹۱۱ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر چلے آئے پھر کچھ عرصہ بعد زمانہ کے اسٹاف میں چلے گئے اب کی ہفتہ وار آزاد کی نگرانی بھی ان کے سپرد ہوئی جو کہ وہیں سے نکلتا تھا۔ کچھ دنوں بعد اودھ اخبار کی اڈیٹری مل گئی۔ اس مسلسل گردش و جانسوز محنت سے صحت بہت گر گئی۔ دمہ کے پرانے مریض تھے وہاں سے بھی تعلق منقطع کر لیا، کچھ دنوں اخبار خادمِ ہند سے بھی وابستہ رہے۔

نظر میانہ قد تھے، دبلے، پتلے، گندمی رنگ، لباس میں سادگی، مزاج میں نفاست، نمود و نمایش سے حد درجہ مجتنب، غرور و تکبر چھو تک نہ گیا تھا۔ نظر جتنے اچھے شاعر تھے اس سے زیادہ اچھے انسان تھے، جیسے عمدہ شعر کہتے تھے ویسے ہی اچھے خوش نویس و مصور بھی تھے، شطرنج کا بھی شوق تھا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ قدرت جس پر زیادہ مہربان ہوتی ہے اس کو غم و الم کی نعمت عطا کرتی ہے اور یوں بھی فیاضی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔ نظر کے کوئی لڑکا نہیں تھا، ایک لڑکی تھی، ایک نواسہ، اور ایک بوڑھی ماں، ان کو نواسہ سے بے حد محبت تھی، پہلے وہ مراجس کے صدمہ سے نیم جان ہو گئے ایک نوحہ میں اپنی دردناک حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں کہ:

تھموتھمو کہ اس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

یہ امر واقعہ ہے کہ ان کے گھر سے بہار رخصت ہو گئی۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ماں کا انتقال ہو گیا یہ دوسرا داغ تھا۔ پڑوس میں ایک بچہ رہتا تھا جس کو دیکھ کر انھیں اپنا نواسہ یاد آجاتا تھا۔ یہ اس کو اپنے پاس ہی سلاتے تھے، ہر وقت ساتھ رکھتے تھے، کچھ ہی دنوں بعد وہ بھی چھت سے گر کر جاں بحق ہو گیا۔ یہ غم ایسا تھا کہ جس سے جاں بر نہ ہو سکے خود بھی یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ:۔

اے انقلابِ عالم تو بھی گواہ رہنا — کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

یہ تھی ان کی ناکام زندگی جس کے نشانات جا بجا ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ طبیعت درد آشنا و مذاق سلیم فطرت سے ودیعت ہوا تھا جس میں ان کی پر حسرت زندگی نے اور رنگ آمیزی کی اور ان کے کلام میں سوز و گداز کا عجیب عالم پیدا ہو گیا، شاید یہی فطرت کا انعام تھا

نظر صرف شاعر ہی نہیں ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ساری عمر میدانِ ادب میں بسر کی جس کا زیادہ تر حصہ نثر نگاری میں گزرا، اس بنا پر ان کے قلم میں بڑا زور تھا اور تحریر میں کمال پختگی، طبیعت نکتہ رس پائی تھی اور نظر وسیع لہذا ان کی تحریروں میں کافی وزن ہوتا تھا۔ پہلی تنقید نقاد لکھنوی کے نام سے ۱۹۰۵ء میں مثنوی گلزار نسیم پر شایع ہوئی تھی جس میں کہ بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے علاوہ میر، داغ، سرور پر عالمانہ مضامین لکھے، جس سے کہ ان کی وسعت و دقتِ نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ خطوطِ اکبر پر بھی ایک سیر حاصل مضمون لکھا تھا — یہ تھے نظر، جو شاعر، ناقد، صحافی، مصور، اور نہ معلوم کیا کیا تھے۔ جن کا نہ آج کلام ملتا ہے اور نہ نثر کے مضامین چند اوراق اور کچھ ذہنوں میں جن کی شخصیت و کارنامجات محفوظ ہیں، آگے چل کر انکا بھی خدا حافظ۔ ضرورت ہے کہ ایسے افراد کی طرف توجہ کی جائے ورنہ زمانہ کا انقلاب تیز گام ان اوراقِ پارینہ کو بایں طور منتشر کر دیگا کہ پھر کوئی نشان تک نہیں مل سکے گا اور یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہو گی۔

رشید حسن خاں

ہمارے دیہاتی گیت

بابل — بابل کے گیت بہت عام ہیں، ان میں سے بعض مشہور یہ ہیں :-

کاہے کو بیاہی بدیس رے سُن بابل مورے

ہم تورے بابل پھاندے کی چڑیاں رین بسے اُڑ جائیں رے ---- سُن بابل مورے

ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے ---- " " "

ہم تورے بابل جنگل کی گئیاں جدھر ہانکو ہنک جائیں ---- " " "

طاق بھری گڑیاں جو چھوڑیں تو چھوڑا سہیلی کا ساتھ رے ---- " " "

ننگے ننگے پیروں بابل جو دوڑا ڈولا تھام رے ---- " " "

تیری بیٹی میرے محلوں کی رانی یہ سب باندی غلام رے ---- " " "

بھائی کو دینی اونچی اٹریا ہم کو دیا ہے بدیس رے ---- " " "

کوٹھے تلے سے پلکیا جو نکلی دان جہیز رے ---- " " "

نیم تلے سے ڈولا جو نکلا بیرن نے کھائی پچھاڑ رے ---- " " "

ڈولے کا پردہ اُٹھا کے جو دیکھا چھوٹا بابل تیرا دیس ---- " " "

یہ منڈھا امیر غریب ہر گھرانے میں گایا جاتا ہے۔ سوا ایک مصرعے کے پورا گیت بین کی شکل ہے۔ لڑکی نے رخصت ہوتے وقت باپ کی بے رخی پر شکایات کے دفتر کھول دئے ہیں اور جو جو باتیں ذہن میں آرہی ہیں بے کم و کاست کہتی چلی جارہی ہے۔ پہلے اپنے آپ کو چڑیوں، کلیوں اور گایوں کی طرح بے بس ظاہر کرتی ہے اور پھر گڑیوں اور سہیلیوں کے چھوٹنے کا غم بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد جذبات میں رد عمل ہوتا ہے اور ڈولے کی روانگی پر باپ کا ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے آنا اور بیرن کا پچھاڑ کھانا بیان کرتی ہے، گھر سے رخصت ہوتے وقت سب سے پہلے جب مکان کا بالاخانہ نگاہوں سے جدا ہوتا ہے تو بیٹے کو اپنے پاس رکھنے اور بیٹی کو نکال دینے کی بے انصافی ذہن میں آتی ہے۔ پھر احاطہ کا نیم کا درخت یاد کرتا ہے اور بے تابی سے ڈولی کا پردہ اُٹھا دیتی ہے تاکہ آخری بار اپنے بابل کے دیس پر ایک نظر ڈال لے۔

انگریزی کے ایک شاعر کولرج کی نظم بھی اسی طرح کی ہے جس میں 'بڈھا ملاح' وطن کی واپسی پر سب سے پہلے

منارۂ روشن دیکھتا ہے اس کے بعد گرجا کا کلس۔ پھر سمندر کا ساحل اور وطن کی پیاری زمین ۔ بابل کا دوسرا گیت ملاحظہ ہو:۔

کہاں چلی بنڑی کہاں چلی

مورے بابل ہارے ہیں بول نباہن ہم چلی
راجہ بابل دیہن نکال جیسے جل مچھلی رے

کہاں چلی بنڑی کہاں چلی

باپ قول ہار چکا تھا بیٹی کیسے اپنے باپ کے قول کو نہ نباہتی' اس لئے جارہی ہے۔ لیکن ماں کے لئے بیٹی کو وداع کرنا ایسا ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر پھینکدینا۔ بابل کا ایک اور گیت سنئے جس کا ماحول بدلا ہوا ہے:۔

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل نیکا منڈھا چھواؤ رے
پربت بانس منگا مورے بابل پاؤں منڈھا چھواؤ رے
شگنی ۔ نجومی ۔ جوتشی سب ہی بیچ بلاؤ رے
(شگون دیکھنے والے)
جیسی لاڈلی بیٹی بابل ویسا ہی کاج رچاؤ رے ۔ ہرے ہرے بانس
منڈھے اوپر کلس برا جے دیکھے راجا راؤ رے
(رونق دے رہا ہے) (بڑے لوگ)
مستک ہاتھی سو بھا دینا بابل دل دریاؤ رے
(ذی ہمت) (بطور رونق)
سونا بھی دینا روپا بھی دینا جڑت جڑاؤ رے
ایک نہ دینی سر کو رے کنگھی میری ساس نند بول رے
(طعنہ دے رہی ہیں)
نو مہینے گرب میں راکھا آج نہ راکھی جائے رے
(پیٹ)
اولے رے کولے گریاں چھوڑیں چھوڑی سکھیوں کا ساتھ رے
(کونے کونے)
بھائی کو دینی اونچی اٹریا ہم کو دینا بدیس رے
لے بابل گھر اپنا ہم چلے پیا کے دیس رے ۔ ہرے ہرے بانس

اس گیت کی فضا امیرانہ ہے۔ منڈھے کے لئے پہاڑوں سے ہرے ہرے بانس منگائے گئے ہیں اور بجائے آم کی پتیوں کے پانوں سے منڈھے کو ڈھکا جارہا ہے۔ منڈھے کے اوپر سونے کا کلس ہے۔ ہاتھی سونا۔ چاندی۔ جڑاؤ زیورات سبھی کچھ ہے لیکن باوجود اس اہتمام کے باپ کنگھی دینا بھول گیا اور لڑکی کو ساس نند کے طعن و تشنیع کا خیال آگیا۔ باپ نے جہیز میں دریادلی دکھادی ہے۔ سونا چاندی اور زیورات کے جہیز کے ساتھ کنگھی نہیں دی گئی (یاد رہے کہ لڑکی کو جہیز میں دی ہوئی ایک ایک چیز کا علم ہوتا ہے) ساس نند کے طعنے کا خیال آنا لازمی تھا۔ سسرال کی سخت زندگی کا ایک دھندلا سا نقش آیا تھا کہ ماں سے بچھڑنے کا غم تازہ ہوجاتا ہے۔ ماں کو طعنے دئے بغیر نہیں رہتی کہ شاید اب مجھے رکھ نہیں سکتیں اور اسی کے ساتھ جب بیٹوں

کے ساتھ طرفدارانہ سلوک کا خیال آجاتا ہے تو جذبات میں ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور 'ہم چلے پیا کے دیس' منہ سے نکل جاتا ہے۔

سسرال کے گیت - شادی کے چند دن بعد جب ابتدائی مسرت کی لہریں کمزور ہو جاتی ہیں، تو متاہلانہ زندگی کی طرف توجہ ہوتی ہے اور اس کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں، لیکن پھر بھی الفت کی چھیڑ چھاڑ باقی رہتی ہے اس نوع کی زندگی کا ایک نقشہ مندرجۂ ذیل گیت میں ملاحظہ ہو:-

کہیو بلم سے جائے بندیا موری ہرانی (کھوگئی)
کوٹھا میں ڈھونڈھیوں برو ٹھا میں ڈھونڈھیوں
ڈھونڈھیوں دیا نا بار بندیا موری ہرانی
کہیو بلم سے جائے .....
ساس سن لے نا اوبھنا بیٹھ مورے انگنا
(برہمن)
بیٹھو بچارو بیٹھا بنائے بندیا موری ہرانی
(نقش)
سٹھیاں بناوت سیاں مسکیانے
کیسی چترہے نار ہمکا چوری لگاوے - بندیا موری ہرانی
کہیو بلم سے جائے بندیا .....

ماتھے کی بندیا کھوگئی - غریب کوٹھے برو ٹھے میں ڈھونڈھ آئی - چراغ جلاکر بھی دیکھا - ساس اور نند کا حجاب مارے ڈالتا ہے - کنایہ زیادہ صاف ہوا جارہا تھا کہ گریز کا پہلو اختیار کیا - برہمن بلایا گیا گویا کہ کوئی بڑی چیز کھوگئی کہ اتنے میں بالم مسکرادئے اور بولے بڑی ہوشیار ہو ہمیں چوری لگاتی ہو، اور اس طرح شوہر کی چھیڑ چھاڑ کھل جاتی ہے اور ڈرامہ ہنسی پر ختم ہو جاتا ہے۔

واردات قلب کا بیان ہندی گیتوں میں عام ہے، ملاحظہ ہو:-

آئے مرے من کے چور آئے مرے من کے چور
نین خوشی سے برسن لاگے ناچی میں بن مور ... آئے مرے من کے چور
سوچا تھا میں من کی باتیں ساری انھیں سناؤں گی
لاکھ منائیں گے وہ مجھکو میں نہ انھیں مناؤں گی
اس دھن میں سب رات گزاری کچھ کہہ نہ سکی ہوئی بھور ..... آئے مرے من کے چور

خوشی کی انتہا یہ ہے کہ آنکھوں میں آنسو آگئے - منانے اور منائے جانے کی اُدھیڑ بن میں صبح ہوگئی اور دل کی باتیں نہ کہہ سکی -

ساس نندوں کے مظالم اور سختیاں ہماری معاشرت کا ایک بڑا بدنما داغ ہیں، وجہ اقتصادی ہو یا نفسیاتی لیکن ہے بہت تکلیف دہ - کبھی کبھی یہ سختیاں ناجایز دباؤ نہیں ہوتیں بلکہ ناموس خاندان کی حفاظت کے خیال سے ساس اپنی بہو کو

بعض باتوں پر روکتی ٹوکتی رہتی ہے۔ اس سے ان کی غرض اتہام والزام نہیں ہوتا بلکہ حفظ ماتقدم ہوتا ہے۔ سختیوں اور مظالم کے گیت تو بہت ہیں لیکن اس پہلو کو واضح کرنے والا گیت کہیں کہیں سننے میں آجاتا ہے۔ یہ گیت ساس بہو کا سوال جواب ہے

گھونگھٹا والی نارینن کرو نیچے

لاؤ نہ ساس موری کھالی گگریا — پنیاں بھرن ہم جاب (جائیں گے)

جو بہوا تم پنیا کو جیہو — ہزاروں چھیل کٹ جائیں

نہ میں باندھوں چھری کٹاری — نہ میں باندھوں (رنگیلے) تلوار

پلکیں تری چھری کٹاری — بھویں ہیں تلوار

نین کرو نیچے

ساس کے تیور ملاحظہ ہوں، بجائے کسی پیارے لقب بڑی بہو یا چھوٹی بہو وغیرہ کے دلہن کو گھونگھٹ والی نار سے مخاطب کر رہی ہے اور حکم دیتی ہے کہ 'نین کرو نیچے' بہو، انجان بنکر ساس سے خالی گھڑا منگواتی ہے تاکہ پانی بھر لائے، ساس اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر تلی ہوئی ہے اور آخر کو صاف صاف کہدیتی ہے کہ اس کا پانی بھرنے کے لئے اس طرح جانا مناسب نہیں، ہزاروں کی جان پر بن جائے گی۔ بہو کمال تجاہلِ عارفانہ سے کہتی ہے کہ میرے پاس تو تلوار کٹاری کچھ نہیں اور آخر کار ساس صاف صاف کہدیتی ہے کہ تیری نگاہیں کیا تلوار سے کم ہیں اس لئے نگاہوں کو نیچا رکھنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

بسم اللہ بیگم

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد سات روپیہ آٹھ آنے (معہ) علاوہ محصول۔

منیجر نگار لکھنؤ

یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے

ترقی پسند ادب

ترقی کدھر؟ اس ادبی تحریک کے علمبرداروں نے اس بات کو واضح نہیں کیا۔ ترقی کے معنی اگر کسی قسم کی سیاسی یا معاشی قدروں کی ترویج ہے تو اُسے تبلیغ کہیں گے نہ کہ ترقی۔ اور ادب جہاں تبلیغی یا مقصدی ہوا وہ ادب نہیں رہ جاتا بلکہ اُسے اصلاح۔ خطابت۔ صحافت۔ پیغمبری وغیرہ ناموں سے نامزد کیا جا سکتا ہے۔ اگر ترقی کے معنی یہ ہیں کہ زمانہ کے بدلتے حالات کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا جائے تو یہ صرف "صحیح ادب" کہلایا جا سکتا ہے۔ 'ترقی پسندی' کا لفظ اس معنی میں اس کے ساتھ بالکل فضول ہوگا۔ ادب حقیقت کا حسین ترین اظہار ہے اور کچھ نہیں۔ اور حقیقت کے معنی ہیں جو کچھ ہے' یا ہو سکتا ہے' اُسے پیش کیا جائے نہ کہ اُسے جسے 'ہونا چاہیے'۔ ادب محض مصوری ہے پیغمبری نہیں۔ یہ صرف خدمت چاہتا ہے مخدومیت نہیں۔ اظہار خواب ہے ——— تعبیر یا تفسیر خواب نہیں اور جہاں آپ نے تعبیر یا تفسیر سے کام لینا شروع کیا وہ چیز ادب نہیں کہلائی جائے گی بلکہ 'کہانت' یا پیغمبری۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری یا ادبیت پیغمبری کا جزو ضرور ہے لیکن پیغمبری جزو شاعری نہیں ہے۔

نظر کی تہذیب

آدمی کی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی نظر کی تہذیب کرتا رہے۔ خالص فنی نقطۂ نظر سے نظر کی تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معیار حسن کو بلند کرتا رہے۔ حُسن کیا ہے اور بلندی کیا؟ حُسن نور ہے اور ترتیب۔ کائنات کی ہر شے میں ایک ترتیب ہے اور اس میں ایک عریاں یا پنہاں نور۔ نورِ پنہاں دقتِ نظر چاہتا ہے، نورِ عریاں رفعتِ نظر۔ خود انسان کی نظر کا ارتقا یہ ہے کہ وہ نورِ پنہاں سے نورِ عریاں کی طرف پرواز کرے۔ نورِ پنہاں ازل ہے اور نورِ عریاں ابد۔ کائنات معہ انسان ان دو قطبین کے درمیان محض ایک دھند ہے کہرہ کے مانند۔

ہر علم اور نظر کا ہر ہدف دو حیثیتیں رکھتا ہے ایک علمی دوسرا علمی بقدر امکانِ انسانی اور انسان کا امکان محدود رہتا ہے مثلاً موسیقی میں کہ آوازوں کا زیر و بم علمی طور پر اپنی رفعت اور پستی کے مدارج میں حد نہیں رکھتا لیکن انسان اُن آوازوں کے ادا کرنے نیز سُن سکنے میں اپنے لئے ایک حد مقرر کر لیتا ہے اور جو آوازیں اس کی سماعت کی امکانی قوتوں سے باہر ہیں اُنھیں مکروہ قرار دیتا ہے، یہی حالت حُسنِ نظر کی ہے۔ ترتیبِ نور کے وہ مدارج جو اس کی قوتِ نظر کی حدوں سے باہر ہیں اور جو لازماً خود اس کی نظر میں اختلال پیدا کر دیتے ہیں ان کو وہ کریہہ اکد بدصورت کہتا ہے۔ اس لئے 'حسن' کیا ہے اور 'کریہہ' کیا؟ وہ مشاہدہ جو انسان کو انسانی زندگی کے حدود میں رکھے اور اُس کے رشتۂ زندگی کو استوار کرے وہ حسین مشاہدہ ہے

اور جو مشاہدہ اُس کے رشتۂ حیات کے زیاں کا باعث ہو مکروہ کہلاتا ہے۔ گویا انسان خود ایک پیمانہ ہے حسن اور کراہت کو ناپنے کا۔ وہ خود مرتب اور منور ہے اس لئے صرف کائنات کی دیگر مرتب چیزوں میں صرف اُنھیں اور اتنی ہی ترتیب کا متحمل ہو سکتا ہے جو اس کی اپنی ترتیب کو متاثر خراب اور منتشر نہ کر دیں۔ لیکن انسان مختلف ہوتے ہیں اس لئے ان کے پیمانے بھی مختلف اور اضافی ہوئے۔ صحیح۔ اس لئے ہمیں ایک ایسے انسان کا تصور کرنا پڑے گا جو مکمل ہو اور ارتقا کی انتہائی منزلیں طے کر چکا ہو۔ ہم ایشیا والوں کی اصطلاح میں اُسے پیغمبر یا اوتار کہتے رہے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں پر لازم ہو گیا اُن ہدایات اور معیاراتِ حسن و کراہت کا ماننا جو یہ پیغمبر یا اوتار (یا مکمل انسانی پیمانے) ہمارے لئے مقرر کر گئے ہیں۔

جمالیات کے متعلق ہمیں کوئی صحیفہ واضح ہدایات کا نہیں ملتا اس لئے اُس میں ہمیں خود اپنی عقل سے کام لینا ہوگا، عقل بتلاتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز مرتب ہو وہ منور بھی ہو یا جو منور ہو وہ مترتب ہو (ترتیب اور نور کے الفاظ بھی دراصل اضافی ہیں لیکن یہاں عام انسان کو معیار بنا کر استعمال کئے گئے ہیں)۔ لیکن انسانی زندگی وابستہ ہے نور سے اور حرارت سے تاریکی اور خنکی میں حیات ممکن نہیں۔ اس لئے ہمیں خالی ترتیب کے بجائے منور اور پرسوز ترتیب کو حسن ماننا پڑے گا پس ترقی اور ارتقا ہمارے جمالیاتی شعور کا یہ ہے کہ ہم ایک 'منور پرسوز ترتیب' سے 'منور تر اور پرسوز تر ترتیب' کی طرف پرواز کریں ورنہ بصورت دیگر رجعت قہقہری ہوگی۔ ترقی پسند ادیب اور فنکار اس امر کو ذہن میں رکھیں ورنہ ان کی منزل حقیقی نکبت ہوگی۔

ایک پروفیسر

آپ کو اگر "نگار" کسی مہینہ کا نہیں پہونچتا

تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ ڈاک میں گم ہو گیا، کیونکہ دفتر سے جس وقت پرچہ روانہ کیا جاتا ہے تو کئی بار جانچ کر لی جاتی ہے اور اس کا امکان ہی نہیں کہ کسی خریدار کا نام رہ جائے۔ اس لئے آپ یہ بدگمانی تو چھوڑ دیجئے کہ دفتر سے غلطی ہوتی ہے، اور ہم کو زیادہ سے زیادہ ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیجئے تاکہ دوبارہ روانہ کیا جائے۔ لیکن اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے اور اگر پتہ میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو اس سے بھی مطلع فرمائیے۔

جو پرچے دفتروں کے پتہ سے جاتے ہیں وہ اکثر گم ہو جاتے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ گھر کے پتہ سے طلب کیجئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وی پی کی رقم ہمیں مہینوں یا کبھی وصول نہیں ہوتی۔ ڈاک خانہ کو لکھا جاتا ہے اور خط و کتابت میں بہت دن لگ جاتے ہیں، ایسی صورت میں بھی پرچہ بند ہو جاتا ہے۔

مدعا یہ کہ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر التزام قایم کیجئے۔ کیونکہ ہمیں سخت تکلیف ہوتی ہے جب پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت آتی ہے اور اس کا ذمہ دار صرف ہم کو قرار دیا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی ڈاک کا انتظام ٹھیک نہ ہو یا آپ کے حلقہ کا ڈاکیا بے پروا ہو۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

آثارِ سحر

مریخ :-

پیکرِ شورش و ہنگامہ و سرتابی ہوں
کوئی فوری کوئی ناری ہے، میں دولابی ہوں

یورش و طنطنہ و جور و جفا میری سرشت
میں جو چاہوں تو جہنم میں بدل جائے بہشت

اک اشارے میں پہاڑوں کی جڑیں ہل جائیں
ناگہاں مشرق و مغرب کے سرے مل جائیں

طرفۃ العین میں گر جائیں فلک بوس محل
میری سانسوں میں فنا۔ میری نگاہوں میں اجل

دشمنی ہے مجھے شاداب سمن زاروں سے
کانپ اٹھتی ہیں چٹانیں مری پھنکاروں سے

خس و خاشاک کو دی سطوتِ آہن میں نے
پھونک ڈالے ہیں گناہوں کے نشیمن میں نے

میری تابش سے خجل زہرہ و مہر و پروین
تیرے بے جان ستاروں میں اجالا ہی نہیں

مجھ سے ہے رعشہ بر اندامِ دلِ کوہ و کمر
مہرِ دریوزہ گری ہے تیرے پیمانے پر

شعلہ افشاں و رجز خواں مری برنائی ہے
میں نے ہر شے کو مٹانے کی قسم کھائی ہے!

ماہتاب :-

اُف ترا جوشِ جنوں، اُف تری آتش نگہی
دہر جلتا ہی رہا۔ آگ بھڑکتی ہی رہی

خاک پر خوں کے بہائے ہیں سمندر تو نے
باغ ویران ہیں، میخانے ہیں سُونے سُونے

وہ جو ہر ذرّے پہ یکگونہ قضا طاری تھی
تیرے پُرسوز عناصر کی شرر باری تھی

زندگی آنکھ سے مستور ہوئی جاتی تھی
منزلِ امن و اماں دور ہوئی جاتی تھی

شکر، صد شکر کہ گردش میں ہے پھر "جامِ سفال"
رد بکار آہی گیا میری شعاعوں کا جمال

باگ ہے قہر و ہلاکت کی ترے ہاتھوں میں
جنتِ کیف و سکوں میری خنک راتوں میں

مشعلِ مہر و محبت مری تابندہ جبیں،
تجھ سے نالاں ہے فلک، تجھ سے پریشاں ہے زمیں

اے کہ اس ہیبت و اجلال پہ مغرور ہے تو
سینۂ چرخ پہ رستا ہوا ناصور ہے تو

قلبِ نوخیز و تمنائے جواں بخشوں گا
میں سسکتی ہوئی دُنیا کو اماں بخشوں گا!

کلام عرشی بھوپالی :-

جب کبھی دردِ محبت میں کمی پائی ہے
اپنی حالت پہ مجھے آپ ہنسی آئی ہے

ایک ایسی بھی محبت میں گھڑی آئی ہے
ان کی نظروں نے کہانی مری دہرائی ہے

وہی شعلے، وہی بجلی، وہی آدابِ قفس
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آئی ہے

دیکھئے کیا ہو اس آغازِ مراسم کا مآل،
ان کی جانب سے مری حوصلہ افزائی ہے

ان کے قدموں پہ جبیں رکھ کے بھی آنسو نہ تھمے
ہائے کیا بات نہ جانے مجھے یاد آئی ہے

تیری بیگانہ نگاہی کے تصدق اے دوست
دل ہی کیا روح تک اب زخم کی گہرائی ہے

آپ کے عہدِ کرم کا بھی تصور ہے گراں
ان مقامات پہ اب آپ کا سودائی ہے

جب انھیں عرضِ الم پر مضطرب پاتا ہوں میں
جو نہ پینے کے ہیں آنسو وہ بھی پی جاتا ہوں میں

دل کی بیتابی کے صدقے جلوہ گاہِ ناز میں
اب تو اکثر بے بلائے بھی چلا جاتا ہوں میں

بہکی بہکی سی نگاہیں، لڑکھڑائے سے قدم
ہائے وہ عالم جب ان کے سامنے جاتا ہوں میں

برہمی کا دور بھی کس درجہ نازک دور ہے
ان کی بزمِ ناز تک جا جا کے لوٹ آتا ہوں میں

ان کی آنکھوں کے تصدق انکی نظروں کے نثار
اب تو عرشی بے پئے اکثر بہک جاتا ہوں میں

نگاہِ شوق سے کب تک مقابلہ کرتے
وہ التفات نہ کرتے تو اور کیا کرتے

کسی کی یاد نے تڑپا دیا پھر آ کے ہمیں
ہوئی تھی دیر نہ کچھ دل سے مشورہ کرتے

یہ پوچھو حسن کو الزام دینے والوں سے
جو وہ ستم بھی نہ کرتا تو آپ کیا کرتے

ہمیں تو اپنی تباہی کی داد بھی نہ ملی
تری نوازش بیجا کا کیا گلا کرتے

شکست ربط کی فرما رہے تھے وہ تردید
ہم اعتراف نہ کرتے تو ہائے کیا کرتے

مطبوعات موصولہ

مرأۃ الشعراء جلد اول تالیف ہے جناب محمد یحییٰ صاحب تنہا بی، اے، ال، ال، بی کی جس میں موصوف نے ولی سے لیکر شیفتہ تک کے تمام مشہور شعراء کے حالات زندگی تحریر کئے ہیں اور انتخاب کلام دیکر اسپر تبصرہ فرمایا ہے۔

ابتدائی ۷۰ صفحات میں انھوں نے پہلے اُردو زبان کی تاریخ بتائی ہے، اس کے بعد اُردو شاعری پر عمومی تبصرہ کرکے اس کی کوتاہیوں کو ظاہر کیا ہے۔

ولی سے لیکر شیفتہ تک اُردو شاعری کے انھوں نے پانچ دور قایم کئے ہیں اور سوائے چوتھے دور کے جس میں انھوں نے صرف چار شاعروں (حسن، جرأت، انشاء و مصحفی) کو رکھا ہے باقی تمام ادوار کو دو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ تقسیم مناسب ہے۔ آزاد کی تقسیم بھی قریب قریب یہی ہے لیکن زمانہ کی تعیین میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اُردو میں شعراء کے تذکرے متعدد پائے جاتے ہیں، لیکن آبِ حیات سے قبل کے تذکرے بہت ناقص ہیں اور ان کو دیکھ کر نہ شاعر کے حالات زندگی پر اطلاع حاصل ہوتی ہے نہ اس کے کلام کے متعلق کوئی تفصیلی رائے معلوم ہو سکتی ہے، انتخاب کلام بھی اس قدر مختصر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ آبِ حیات سے جدید تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ وہ تذکرہ سے ہٹ کر خود ادبی چیز ہوگئی ہے اور واقعات و روایات کی تحقیق کئے بغیر رطب و یابس سب درج کر دیا گیا ہے۔ زمانۂ حال کے تذکروں میں گلِ رعنا اور شعر الہند واقعی صحیح معنے میں تذکرے ہیں۔ انمیں سے شعر الہند کی بابت تو تنہا صاحب نے کچھ نہیں لکھا، لیکن گلِ رعنا کی بابت وہ لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے، حالانکہ جو خصوصیت اس تذکرہ میں ہے کسی اور میں نہیں پائی جاتی اور تنہا صاحب کا یہ کہنا کہ جہاں تک تبصرہ کا تعلق ہے مولوی عبدالحی اپنا دامن صاف بچالے گئے ہماری رائے میں درست نہیں۔

تنہا صاحب کا تذکرہ اس لحاظ سے کہ اس میں تمام مشہور شاعروں کا حال و انتخاب کلام جدا جدا نظر آتا ہے اور ہر ایک کی شاعری پر تبصرہ بھی الگ الگ کیا گیا ہے، یقیناً زیادہ کارآمد چیز ہے۔ شعراء کے کلام پر تنہا صاحب نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی بے لاگ ہے، لیکن انھوں نے فنِ نقد کے اس اصول کو اکثر جگہ ترک کر دیا ہے کہ ہر شاعر کے زمانہ و ماحول کو سامنے رکھکر اس کے کلام پر رائے زنی کرنا چاہئے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ تذکرہ یقیناً بہت مفید ہے اور خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے لئے

تو بڑے کام کی چیز ہے۔

تنہا صاحب فطرت کی طرف سے تاریخ کا ذوق لیکر آئے ہیں اور اس سے قبل بھی انکی جتنی تصانیف شایع ہوئی ہیں وہ سب تاریخ و سیرت نگاری ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

یہ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور ۵۸۱ صفحات پر محیط ہے۔ قیمت دس روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔

تاریخ انقلابات عالم جلد اول

تصنیف ہے مولانا ابو سعید بزمی ام۔اے کی جو کسی وقت ہندوستان کے انقلاب پسندوں میں خاص امتیاز کے مالک سمجھے جاتے تھے اور جنھوں نے بھوپال میں تقریباً دو سال تک مقید رہنے کے بعد عملی انقلاب پسند ہونے کی حیثیت سے ملک میں بڑی عزت حاصل کی۔

اس تصنیف کی بنیاد ۱۹۴۰ء ہی میں پڑ گئی تھی جب وہ بھوپال کے زندانی تھے، لیکن بعض ناگزیر حالات کی بنا پر وہ اس کی تکمیل ۱۹۴۶ء سے قبل نہ کر سکے۔

یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، تاریخ ہے انقلابات عالم کی جس میں فرانس، روس، ترکی، مصر، شام، عراق، فلسطین، حجاز، طرابلس، ایران، افغانستان، اٹلی، جرمنی، اور اسپین کی انقلابی تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے پہلے تین ابواب تمہیدی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں انقلاب کا سبب ہمیشہ خیر و شر کے تصادم سے شروع ہوا ہے اس کے بعد چار ابواب میں نوح، ابراہیم، موسیٰ، زرتشت، گوتم بدھ، کنفیوشس کے زمانہ سے بحث کر کے ساتویں باب سے انقلاب اسلام کا ذکر شروع کیا گیا ہے جو نویں باب پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد عیسوی عہد کے دور اصلاح، یوروپ کے نشاۃ الثانیہ، انقلاب فرانس اور اشتراکیت و اشتمالیت پر اظہار خیال کیا گیا ہے، سولھویں اور سترھویں باب میں ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اور اس کے نتائج سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد کے ابواب میں دوسرے ملکوں کے انقلابی تحریکوں کا ذکر ہے، جن کی فہرست ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

موضوع جسقدر اہم ہے ظاہر ہے، لیکن اس کتاب کی اہمیت موضوع کے علاوہ اسلوب بیان سے بھی خاص تعلق رکھتی ہے۔ اس قسم کی تصانیف اکثر و بیشتر بہت خشک ہوتی ہیں اور ان میں ادبی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تصنیف زبان و بیان کی شگفتگی کے لحاظ سے اس قدر دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کرتا کہ وہ تاریخ ایسے خشک مبحث کا مطالعہ کر رہا ہے۔

جناب بزمی نے، مدینہ کی ادارت کے زمانہ میں اپنی ادیبانہ رنگ کی صحافت اور خطیبانہ انداز بیان کے لحاظ سے نہایت کامیاب صحافی کی حیثیت حاصل کر لی تھی، اور اس کے بعد جب لاہور میں انھوں نے ایک روزنامہ کی ادارت کے فرائض انجام دئے تو یہ شہرت اور زیادہ وسیع ہو گئی، گو سیاسی نقطۂ نظر بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اس لئے ان کی یہ تصنیف ایک ایسے آزمودہ کار

صحافی کی تصنیف ہے، جو نہ صرف اپنی رائے کی پختگی بلکہ اپنی ادبیت کے لحاظ سے بھی ایک خاص درجۂ امتیاز کا مالک ہے اور اس بناء پر اسے دلچسپ و مفید ہونا ہی چاہئے۔

ضخامت ۵۴۰ صفحات، طباعت و کتابت بہت صاف، جلد مضبوط، گرد پوش رنگین - قیمت دس روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- کتاب منزل - لاہور۔

جب خون بہہ رہا تھا

یہ تصنیف بھی مولانا ابو سعید بزمی کی ہے۔ یہ کتاب گویا ہندوستان کی تقسیم پاکستان کے قیام اور ان دردناک حالات سے تعلق رکھتی ہے جو تقسیم کے بعد پیدا ہوئے۔

جناب بزمی کی سیاسی پالیسی ہمیشہ وہی رہی ہے جو ایک نیشنلسٹ مسلمان کی ہونی چاہئے۔ تقسیم ہند کے وہ بھی مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی اور صورت پیدا ہو جائے، لیکن اس دوران میں وہ لاہور چلے گئے اور صوبوں کی تقسیم کے بعد جو کشت و خون ملک میں ہوا اس سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی رائے بدل دی اور مسلمانوں کی بقا کا تنہا طریقہ ان کو بھی قیام پاکستان ہی نظر آیا۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے پہلے تمام ان سیاسی حالات پر روشنی ڈالی ہے جو تقسیم ہند سے قبل یہاں پائے جاتے تھے اور پھر کانگرس و مسلم لیگ کے اختلافات کو پیش کرتے ہوئے، تقسیم ہند کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ آخر میں انھوں نے پاکستان کی تعمیر مستقبل کے متعلق بھی مفید مشورے دئے ہیں۔

موضوع کے علاوہ یہ کتاب جناب بزمی کی خطیبانہ انداز تحریر کے لحاظ سے بھی بڑی دلچسپ چیز ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات - مجلد - گرد پوش رنگین - قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ:- کتاب منزل - لاہور۔

بجوان غم بری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے، ولایت تک اس کے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں طبیتی ادویات اور کشتہ اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس کے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر لیتے ہیں۔ اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بھولی ہوئی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آب حیات کے تصور کرنا چاہئے۔ اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی قیمت سات روپیہ آٹھ آنے ہے۔ جسم میں اضافہ کر دے گی، اس کے استعمال کے دوران آپ کے جسم میں تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخسار دل کو بلکل گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ اور مثل گندنا کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا فانی نہیں ہے بلکہ ہزار دن ما یوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان ہو گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ جسم و جان میں کمی نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ مجرب کر کے دیکھ لیجئے اس کے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگا لیجئے۔ میں اعلان کر رہا ہوں کہ ظرفان کا کہنا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ مقابلوں سے ہوشیار رہیے۔ میری ۳۰ سالہ شہرت پر بھروسہ فرمایئے

پتہ:- حکیم تابت علی شیخ زبان، خوش کلام

(حکیم شفوی مولانے روم صاحب)

محمود نگر سے لکھنؤ - یوپی

میر انیس کی زبان

اُردو زبان کو جو ترقی لکھنؤ میں ہوئی وہ ہر طرح داد کے قابل ہے، دہلی سے آکر یہاں اس زبان مین ایک خوبصورتی پیدا ہوئی اور زبان کو سب سے زیادہ خوبصورت بنانے والے میر انیس ہیں۔

میر انیس کا زبان کے سلسلہ میں یہ نصب العین تھا:۔

روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس تمامتر شرفا کی زبان پر زور دینا چاہتے تھے۔ شرفاء کا ایک خاص طبقہ تھا جو ایک طرف علماء سے کمتر اور دوسری طرف جہلا سے بالاتر تھا۔ یہ طبقہ عالموں سے رجوع ضرور کرتا تھا مگر ان کی مخصوص زبان سے جس میں بڑے بڑے الفاظ اور علمی اشارات ہوتے تھے پرہیز کرتا تھا، دوسری طرف یہ عوام کی سوقی زبان کو پست سمجھتا تھا۔ مرثیہ نگار اور مرثیہ خوان کے لئے زیادہ شرفا ہی کو سامنے رکھنا ضروری تھا اور اپنی تصنیف کو شرفاء ہی کی زبان میں پیش کرنے سے اس کا مقصد پورا ہوتا تھا۔ مرزا دبیر نے شرفاء کی زبان کی جگہ علماء کی زبان کو اپنا معیار ٹھہرایا۔ میر انیس بھی کہیں کہیں عالمانہ زبان استعمال کرتے ہیں مگر انکی طبیعت اس زبان سے مناسب نہ تھی۔ انھوں نے لکھنؤ کے شرفاء ہی کی زبان کو اپنایا، یہ ان کے گھر کی زبان تھی اور اسی زبان میں ان کے بہترین مرثیے تصنیف ہوئے۔

شرفائے لکھنؤ کی زبان کو اکثر بیگماتی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مسلم ہے کہ زبان کی مالک مردوں سے زیادہ عورتیں سمجھی جاتی ہیں اسی لئے دُنیا کا ہر فرد ایسی زبان کو مادری زبان کہتا ہے۔ لہذا لکھنؤ کے شرفاء کی زبان کو بیگماتی زبان کہنا کوئی بیجا بات نہ ہوگی۔ میر انیس کی زبان بیگماتی زبان تھی۔

میر انیس کے یہاں اس زبان کے بہترین نمونے ان مقامات پر ملتے ہیں جہاں وہ اہلِ بیت کی تقریریں رقم کرتے ہیں۔ مثلاً مرثیہ "فرزند محمد کا مدینہ سے سفر ہے" میں حضرت زینب کی تقریر:۔

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر — بہنوں ہمیں یثرب سے لئے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر — پہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی
اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی — فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اس کا نہ کھاتی

بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی
بے جائے مجھے بات کوئی بن نہیں آتی
ظاہر میں تو مابین لحد سوتی ہیں اماں
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں

ہے روح پہ اماں کی قلق کرتی ہیں زاری
سر پیٹتے میں نے انھیں دیکھا کئی باری
روداد بیاں کر گئی ہیں مجھ سے وہ ساری
فرماتی تھیں بھائی سے خبردار میں واری
غمخوار ہے تو اور خدا حافظِ جاں ہے
نہ باپ ہے سر پہ مرے بچے کے نہ ماں ہے

یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت
کچھ جان کی تھی فکر نہ ان کو دمِ رحلت
آہستہ یہ فرماتی تھیں باصد غم و حسرت
بشیر سدھارے جو سوئے وادیِ غربت
اس دن مری تربت سے بھی منھ موڑیو زینب
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

اماں کی وصیت کو بجا لاؤں نہ کیونکر
گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر
دو بہنیں ہیں ماجائیاں اور ایک برادر
رسّی سے بندھیں ہاتھ کہ بلوے میں کھلیں سر
جو ہوئے سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

جو مثالیں ہم مصوری، بزم نگاری اور رزم نگاری کے سلسلہ میں دے آئے ہیں، ان کی زبان بھی بنیادی طور پر اس زبان سے مختلف نہیں ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر انیس ایک خاص طبقہ کی زبان کے ماہر تھے اور اس زبان کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ زبان زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو سکتی ہے؟ کیا اس زبان میں وہ آفاقیت ہے کہ ہر طبقہ اور ہر زمانے کے لوگ اس سے ہمیشہ مدد لیتے رہیں۔ اگر زبانوں کے ارتقا کی تاریخ پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے زبان کی داغ بیل کسی بولی سے پڑتی ہے پھر اسکو وسعت حاصل ہوتی ہے اور وہ ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے، لیکن اس کے بعد جب یہ رنگ ناکافی ثابت ہوتا ہے تو زبان کی تشکیل پھر از سر نو کرنا پڑتی ہے۔

اُردو کی داغ بیل دکھنی زبان کے مصنفین نے ڈالی۔ میر و سودا نے وسعت دی، پھر ناسخ نے اس کو جلا دیکر اس کا ایک خاص مزاج بنایا اور یہی زبان لکھنؤ کے مہذب طبقہ کی زبان ہو گئی۔ یہ زبان اس میں شک نہیں بہت صفائی و سلاست رکھتی ہے مگر ہے یہ ایک خاص قسم کی زبان جو ایک خاص مقام اور طبقہ سے مخصوص ہے اور باوجود تمام خوبیوں کے ایک محدود

قسم کی زبان ہے۔ اس لئے یہ زبان ایپک شاعری کی زبان نہیں ہو سکتی کیونکہ ایپک ہمیشہ عالم و فلسفی کی تصنیف ہوتی ہے ملٹن نے برسوں علم و فضل حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایپک شاعر ہو سکے۔ یہ زبان ڈرامہ کی زبان ہونے کے لئے بھی بہت محدود ہے۔ ڈرامہ میں ہر قسم کے اشخاص آتے ہیں اور ڈرامہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے طبقہ کی زبان بولے۔ شیکسپیر کے یہاں بادشاہوں سے لیکر فقیروں اور اٹھائی گیروں تک ہر طبقہ کے مختلف افراد آتے ہیں اور ہر ایک اپنے طبقہ کی زبان بولتا ہے۔ میر انیس کی زبان صرف اس قسم کے ڈرامہ کی زبان ہو سکتی ہے جس کے افراد ایک ہی گھر کے ہوں اور وہ گھر بھی لکھنؤ کے کسی شریف کا گھر ہو۔ انھوں نے اُردو زبان کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو شیکسپیر نے انگریزی زبان کے لئے کیا۔ انگریزی زبان باوجود اس کے کہ وہ اب دُنیا بھر کی زبان ہے اور ہر قوم اسے اپنے مزاج کے موافق ڈھال چکی ہے اور اس میں ہر سال ہزاروں قسم کے نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں، پھر بھی شیکسپیر کی زبان کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جو ترقی بھی اس میں کی جاتی ہے اس کی مثال شیکسپیر کے یہاں ضرور مل جاتی ہے۔ میر انیس کی زبان کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا۔

بعض کا خیال ہے کہ انیس کے مرثیوں میں ربط و تسلسل کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں اور میر انیس کے مرثیوں میں وہی تعمیری خوبی ہے جو یونانی ڈرامہ میں اتحادِ زمان و مکان اور ترتیب واقعات کے لحاظ سے پائی جاتی ہے، لیکن آیئے دیکھیں کہ مرثیوں میں اس قسم کا اتحاد ہم کو ملتا ہے یا نہیں۔

مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" کو لے لیجئے اور دیکھئے کہ اس مرثیہ میں مکان و زمان کا لحاظ کتنا کیا گیا ہے مرثیہ کی ابتدا صبح کے منظر سے ہوتی ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ خوش الحان چڑیاں چہچہا رہی ہیں یعنی یہ ایسا مقام ہے جہاں بہار پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر آفتاب کی حدت اور تاب و تپ کا ذکر ہوتا ہے اور گرمی کی یہ شدت ہے کہ دن کا رنگ رات سے زیادہ سیاہ نظر آتا ہے اور اگر پائے نگاہ بھی کہیں ٹھہر جائے تو اس میں لاکھ آبلے پڑ جائیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ مقام کون ہو سکتا ہے جہاں بہار و خزاں دونوں کمال شدت کے ساتھ ایک ہی وقت میں موجود ہوں۔

اسی طرح مرثیہ "جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا" کو لے لیجئے یہاں شروع میں وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جب حضرت عباسؑ کو فوج شام نے نہر پر خیمے نصب کرنے سے روکا اور حضرت کو جلال آگیا۔ یہ واقعہ عاشورہ سے تین دن پہلے کا ہے، لیکن اس مرثیہ میں حضرت عباس کا میدان میں جانا بھی بیان ہوا ہے جو تین دن بعد کا واقعہ ہے، بات یہ ہے کہ اتحاد زمان و مکان کا لحاظ رکھنے کی مرثیہ نگاروں کو ضرورت نہ تھی اور نہ انھوں نے اس کی طرف دھیان دیا۔

اب رہا سوال ترتیب کا سو مرثیوں میں اس کا لحاظ بھی نہیں رکھا گیا، ایک بات ضرور ہے کہ قریب قریب ہر مرثیہ کا مطلع اس خاص واقعہ کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے جو اس میں بیان ہوا ہے مگر آگے چلکر کوئی منطقی یا واقعاتی ربط باقی نہیں رہتا۔ مثلاً مرثیہ "بخدا فارس میداں نہ ہوا تھا حر" لے لیجئے۔ اس مرثیہ کے مطلع سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں حضرت حرؑ کی بہادری اور ان کے رزم کا ذکر ہوگا۔ کچھ بندوں تک تو حرؑ کی خوبیٔ قسمت کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ نار کو چھوڑ کر نور کی طرف آئے۔ لیکن اس کے بعد ان

کے دیگر انصار کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور پھر فوج کی معرکہ آرائی کا:۔

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

اس کے بعد امام حسینؑ سامنے آتے ہیں اور ایک طویل تقریر سے اتمام حجت فرماتے ہیں۔ اس تقریر کا فوج شام پر اثر ہوتا ہے اور حرؑ خاص طور سے متاثر ہوتا ہے۔ پھر حرؑ اور ابن سعد کے درمیان طویل بات چیت ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرؑ فوج شام کو چھوڑ کر امام کی طرف آجاتے ہیں، یہاں آکر وہ امام سے رن کی اجازت مانگتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔ یہ میر انیس کا وہ مرثیہ ہے جس میں ہم کو سب سے زیادہ ربط و اتحاد ملتا ہے مگر کسی خاص شاعرانہ تاثر کے تحت خیالات کی ترتیب اس میں بھی نہیں ہے۔ دوسرے مرثیوں میں تو متعدد قسم کے بے ربط گریز ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مربوط صورت میں لکھے ہی نہیں گئے اکثر مرثیوں میں تو مضمون شروع کچھ ہوتا ہے اور بدل کر کچھ اور ہو جاتا ہے، جیسے مختلف قسم کے پیوند جوڑ کر کوئی چادر طیار کی جائے۔

بات یہ ہے کہ ہماری شاعری میں وسعت نقش و اثر کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی گئی۔ یورپ کی شاعری کا فن اس مصور کا فن ہے جو گتوں بھی کر مچ پر ایک تصویر بنائے برخلاف اس کے ہماری شاعری کا فن اس مصور کا فن ہے جو انگوٹھی کے نگینوں یا چاول کے دانوں پر نقش و نگار بنائے۔ میر انیس کے یہاں وہ خصوصیت کوئی معنے نہیں رکھتی تھی جو یورپ میں یونانی ڈرامہ اور ایپک کے لئے ضروری ہے اور جس کے مطابق ہر بڑے شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک طویل نظم کامیابی کے ساتھ لکھے اردو شاعری شعروں اور بندوں کی شاعری ہے اور انگریزی شاعری نظموں کی شاعری ہے۔ دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

میں نے جو میر انیس کے کلام میں ڈرامہ، ایپک وغیرہ کا فقدان ظاہر کیا ہے اس سے میرا مقصد میر انیس کی ہتک نہیں بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ جو لوگ یورپ کی شاعری کے مقابلہ میں مرثیوں کو پیش کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ایک صاحب نے مجھے سمجھانے کے لئے کہ میر انیس کے یہاں کردار نگاری ہے۔ مرثیہ "بخدا فارس میدان تہور تھا حرؑ" میں امام علیہ السلام کی طویل تقریر کا ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا اس میں کوئی کردار نہیں ملتا۔ میں نے ان کو مختلف مرثیوں سے مختلف ٹکڑے دکھائے اور کہا کہ یہ نہیں بلکہ ان ٹکڑوں میں بھی نفسیات و کردار ملتا ہے مگر ان ٹکڑوں سے کوئی انفرادی صفت متعین نہیں ہوتی اور نہ ان میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ انھوں نے شیکسپیر کے "میکبتھ" سے ایک تقریر مجھے سنائی اور کہا کہ جو کردار نگاری اس تقریر میں ہے وہی امام علیہ السلام کی تقریر میں ہے۔ میں نے کہا کہ جو تقریر میکبتھ کی آپ نے سنائی ہے وہ الگ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ چودہ ڈرامے ہیں جن میں تقریریں ہیں ان سب کو ایک جگہ رکھئے اور ان سے ملا کر کچھ نفسیاتی خصوصیات متعین کیجئے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ کردار نگاری کسے کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے میر انیس کے یہاں کسی فرد کی کوئی خصوصیت ایسی ظاہر نہیں کی گئی جو دوسرے میں نہ پائی جائے۔

الغرض مرثیہ کو نہ ایپک کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے نہ ڈرامہ کے سلسلہ میں۔ وہ صرف بیانیہ شاعری ہے جو انگریزی میں ہمیں کیٹس کے یہاں ملتی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ میر انیس کے مرثیوں میں چونکہ تقریریں ہیں اس لئے وہ ڈرامہ ہوسکتا ہے، لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر تقریر، ڈرامہ کی تقریر نہیں ہوا کرتی۔ ڈرامائی مکالمہ قصہ اور کردار کی انفرادیت کا انکشاف کرتا ہے اور بیانیہ شاعری کے مکالمہ میں محض ایک وقتی نفسیاتی حالت کی طرف اس طرح اشارہ ہوتا ہے کہ کسی مخصوص حالت کی عام صفات ظاہر ہوجائیں اور میر انیس کے یہاں ہمیں اس قسم کے مکالمے ملتے ہیں۔

مرثیوں کی دلچسپی ــــ ادب پاروں کی قیمت اس بات پر مبنی ہوتی ہے کہ ان میں کب تک اور کس قسم کی دلچسپی لی جاسکتی ہے اور اس حیثیت سے مرثیہ کی قیمت بہت کم ہے کیونکہ وہ شخص جو لکھنؤ کا باشندہ نہیں ہے اور شیعہ مذہب سے بھی تعلق نہیں رکھتا وہ مرثیوں میں ایک مخصوص وقتی و مقامی خوبی زبان کے علاوہ اور کچھ نہ پائے گا۔

اس چیز کو پورے طور پر واضح کرنے کے لئے مرثیہ "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" کو لے لیجئے جو میر انیس کا شاہکار ہے اور غور کیجئے کہ اس میں وہ کونسی باتیں ہیں جو اب بھی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔

اس مرثیہ کے ابتدائی دو مصرعوں میں آمد صبح کا ذکر ہے اور اس کے بعد امام علیہ السلام کی تقریر ہے جو دو بندوں میں ختم ہوتی ہے۔ امام اس دن کی عظمت کے بارے میں کچھ فرماتے ہیں اور اس دن کی آمد سے خوش ہیں کہ یہ وصال کا دن ہے۔ اس تقریر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ امام کے دل میں ایک عزم ہے اور وہ خنداں پیشانی کے ساتھ قربانی کے لئے طیار ہیں مگر تقریر کی زبان اور لہجہ وہ نہیں ہے جو ایسے موقعوں پر ہیروؤں کی ہوتی ہے۔

اس کے بعد امام کے انصار اُٹھ اُٹھ کر امام کے پاس آتے ہیں جن میں سے ہر ایک فاخرہ لباس زیب تن کئے ہوئے ہے اور ہر ایک کے کپڑے عطر میں بسے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد میر انیس ہر ایک کی مدح میں قصیدہ خوانی کرتے ہیں، لیکن کسی کی کوئی انفرادی خصوصیت بیان نہیں کرتے۔ سبھی گلبدن، خوبرو اور خوش خصال ہیں۔

اس کے بعد صبح کا بیان ہے جس کی بے ربطی کا ذکر ہم کرچکے ہیں۔ پھر خیموں کی تعریف ہوتی ہے جو دشت میں نصب ہیں۔

اس کے بعد دفعتاً یہ بتایا جاتا ہے کہ:۔ ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں
تشریف جانمازپہ لائے شہِ زماں

حضرت علی اکبر اذان دیتے ہیں اور اس اذان کی مدح میں کچھ بند ہیں اس اذان کی آواز خیمہ میں جاتی ہے اور وہاں اہلِ حرم کی جو حالت ہے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے اور وہی ہمدردی کے ساتھ اس کا اثر لے سکتا ہے جو لکھنوی عورتوں کے جذبات سے مانوس ہو چنانچہ حضرت زینب فرطِ تاثر میں کبھی یہ فرمانے لگتی ہیں کہ:۔

صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار
اور کبھی یہ کہ:۔ میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے

ایسی باتوں پر ان لوگوں کو جو لکھنؤ کی تہذیب اور لکھنوی عورتوں کی بات چیت سے واقف نہیں ہیں بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔

اس کے بعد نماز کا بیان ہے جس میں زیادہ تر بناوٹی زبان سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ و استعارات نے آورد پیدا کردی ہے۔ ابھی نماز ختم بھی نہ ہونے پاتی ہے کہ تیر آکر گرنے لگتے ہیں۔ اس پر

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں — تم کہدو جا کے خیمہ میں یہ اے پدر کی جاں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں — بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو

امام کی اس تقریر کا رنگ ابتدائی بندوں کے منافی ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ قربانی کا مصمم عزم کئے ہوئے ہیں۔ اتنے میں خیمہ کے دروازے سے فضہ کی صدا آتی ہے اور فضہ کی تقریر ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو میدانِ کارزار کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔

پھر امام علیہ السلام اُٹھ کر خیمہ میں آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت زینب دعا کر رہی ہیں، اس دعا کو سن کے امام جو فرماتے ہیں وہ یہ ہے:۔

بولے قریب جا کے شہ آسماں جناب — مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب — خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہ ثواب

یہ تقریر موقعہ کے لحاظ سے کتنی ہلکی ہے۔

پھر امام علیہ السلام تبرکات کا صندوق منگواتے ہیں اور ان کپڑوں کی تعریف میں کچھ بند آتے ہیں۔ امام جب کپڑے پہن چکتے ہیں تو حضرت زینب ان کی بلائیں لیکر رونے لگتی ہیں اور پھر اسلحہ کا صندوقچہ کھولا جاتا ہے تو وہ اپنا منہ پیٹنے لگتی ہیں ان اسلحہ میں ذوالفقار کو دیکھ کر امام کا یہ حال ہوتا ہے کہ:۔

قبضے کو چوم کر شہ دیں روئے زار زار

امام اسلحہ لگا چکتے ہیں کہ علم آتا ہے۔ اس علم کے پاس سب لوگ اسی طرح آتے دکھائے گئے ہیں جیسے لکھنؤ کے گھروں میں علم آنے پر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔

کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام — روتی تھیں تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیرِ علم آکھڑے ہوئے

ان [illegible] دل پر ان لوگوں کے سامنے جو لکھنؤ کے گھروں میں علم اُٹھتے دیکھ چکے ہیں ایک معاشرت کی تصویر آجاتی ہے۔ میر انیس

کے مجلسیوں کے دل بھی اس احساس سے بھر آتے ہوں گے مگر یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں کہ امام کا علم اسی طرح خیمہ میں لایا گیا ہوگا اور اس کو دیکھ کر اسی طرح گریہ وزاری ہوئی ہوگی۔

اس علم پر حضرت زینب کے فرزندوں کا حق ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو متضاد صورتوں میں میر انیس نے ظاہر کیا ہے۔ یہ واقعہ کسی اور مرثیہ نگار نے نہیں باندھا۔ یہ حق کا احساس اس زمانے کے لکھنؤ کی خاص ذہنیت تھی اور اسی احساس سے وہ خانہ جنگیاں ہوئیں جنھوں نے لکھنؤ کی سوسائٹی کو خاص طور سے تباہ کیا۔ مگر انیس کے سامعین کے لئے یہ بات بڑی دلچسپی کی ہوگی اور اسی لئے انھوں نے ہر جگہ اس کو بلا ضرورت طول دیا ہے۔ مرثیہ میں مکانی تخیل اس قدر مبہم ہے کہ نہیں معلوم ہوتا مختلف لوگ کہاں کہاں ہیں، کیسے الگ ہو جاتے ہیں اور پھر کیونکر پاس آجاتے ہیں۔ مرثیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب اور امام حسین آمنے سامنے ہی تھے کہ علم کہیں سے آگیا۔ اب حضرت زینب اپنے بچوں سے باتیں کرنے لگیں جو امام نے نہیں سنیں یہ کیسے ممکن ہے۔ حضرت زینب شاید الگ ہٹ گئی تھیں کیونکہ ہم کو پھر بتایا جاتا ہے کہ امام ان کے پاس آئے۔ اس قسم کی بے ربطی ہر جگہ مرثیوں میں ملتی ہے۔

خیر علم کا معاملہ چلتا ہے اور امام حسین علم حضرت زینب کو دے دیتے ہیں اور وہ حضرت عباس کو دیتی ہیں۔ جس شخص نے اور مرثیے بھی پڑھے ہوں گے وہ فوراً چونک پڑیگا کہ یہاں پر قصہ بالکل ہی مختلف طریقہ پر بیان ہوا ہے۔ بعض مرثیوں میں بتایا گیا ہے کہ علم حضرت عباس کو پہلے مل چکا تھا اور اس کے بعد حضرت زینب اور ان کے فرزندوں میں باتیں ہوئیں اور جو باتیں ہوئیں وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔

اس کے بعد حضرت سکینہ آکر مشک دیتی ہیں۔ حضرت عباس علم لیکر باہر آتے ہیں۔ امام حسین گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور گھوڑے کی تعریف کے کچھ بند آتے ہیں۔ اس مرثیہ میں گھوڑے کی تعریف مختصر ہی ہے۔ امام حسین کی فوج کے جوانوں کی مدح ہوتی ہے اور آسمان سے حوریں تعریف کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ تمام تعریفیں صرف ظاہری حُسن کی ہیں۔ پھر حضرت کی جنگ کی بابت ایک ایک دو دو بند آتے ہیں اور آخر کار امام حسین اکیلے رہ جاتے ہیں۔ حضرت علی اصغر کی شہادت کا بیان کچھ طویل ہے مگر دوسرے بیانوں سے بالکل مختلف ہے۔

اب امام حسین کی جنگ شروع ہوتی ہے، اس میں گرمی کی شدت کا بھی ایک سماں آتا ہے پھر ایک تصویر امام کی بے بسی کی ہے، یہاں رزم میں دو حریفوں کی جنگ دکھائی ہے جس کی بابت ہم پہلے کہہ چکے ہیں اور تلوار کی تعریف بھی اس طرح کی ہے جیسے تمام مرثیوں میں ملتی ہے۔ درمیان میں ایک آدھ جگہ شاعر اپنی طرف گریز کرتا ہے۔ اکثر جگہ زبان اور طرزِ ادا کمال پر پہونچ جاتی ہے۔

مثلاً ذیل کے بند میں زبان کی معنوی اور صوتی حسن ملاحظہ ہو:-

لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے — وہ بدنظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑائے

ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
غصّے میں آکے گھوڑے نے بھی دانت کڑکڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعیں کے پاؤں
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں

امام علیہ السلام کے گھوڑے سے گرنے کی تصویر بھی بہت دلکش ہے لیکن ان کی شہادت کے بعد حضرت زینب کی زاری بالکل لکھنوی معاشرت کی چیز ہے۔

مرثیہ ختم کرنے پر ہمارے پاس میر انیس کے کلام کی صرف شیرینی باقی رہ جاتی ہے اور اس کے باوجود کوئی چیز ایسی نہیں رہ جاتی جو ہمارے خیالات کو گہرائی یا بلندی کی طرف لیجائے۔ مادی اشیاء کا ذکر، رسمی جذبات کی ترجمانی اور واقعات کی عدم ترتیب ہر جگہ نظر آتی ہے، مگر ہاں ان کی تلافی زبان کی خوبی اور طرز ادا سے بہت کچھ ہو جاتی ہے۔

مکتوبات نیاز

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں۔ ہر چکے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیین کا مذہب۔

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ فن اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت:-

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصۂ اول للعہ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶ — نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری فروری، مارچ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں -

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دلیں نمبر" ہے جس میں ایک ہمسایل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا -

قیمت [illegible] علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور رس اور اُن کارناموں کو نہ بھولیں جو پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہلِ قلم کے شایع کئے گئے ہیں - اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے - قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے "منیجر"

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر خریداری نمبر دیا گیا تو تعمیل و شوار ہے

مطبوعہ نگار بک ایجنسی لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر) ایس حسین